انجانے دُکھوں کا مغنی

عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی

مرتب

تنویر شاہد محمد زئی

کلاسیک

۴۲۔ دی مال لاہور

آفتابِ منور

معروف فلسفی ''شوپنہار'' کہتا ہے کہ زندگی ایک سمندر ہے جسے چٹانوں اور گردابوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ''شوپنہار'' کے شاگرد ''ہارٹین'' کے خیال میں ''انسانی زندگی میں مسرت اور شادمانی کے ذخیرے سے زیادہ غم والم کا ذخیرہ ہے'' اور پھر ارسطو کا یہ قول میرے موقف کا خوبصورت تمہیدی ترجمان ثابت ہوگا کہ ''میں مسرت کے مقابلہ میں غم کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ بہرحال انکی آراء کی روشنی میں یہ کہنا آسان ہوجاتا ہے کہ دنیا میں غم و درد سے بچ نکلنا بے حد مشکل ہے اور خصوصاً جب غم بھی غم جاناں کی صورت انسان پر حاوی ہو جائے۔ مثال کے طور پر میرؔ کا یہ شعر

مصائب لاکھ تھے پر جی کا جانا
عجب اِک سانحہ سا ہوگیا ہے

یہی وجہ ہے کہ ہمارے لوک گیتوں میں منظر کشی اور طربیہ گیتوں سے زیادہ ''حزنیہ گیت پُرکشش ہیں۔ لوگ کسی بھی فن پارہ کے مضراب کو اٹھا کر دل کے ساز پر چوٹ لگاتے ہیں۔ اگر مجھے درد کا سفیر عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی (پرائیڈ آف پرفارمنس) سے اپنی عقیدت فریب نہیں دیتی تو مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں ہے کہ موجودہ لوک گائیکی کے اُفق پر اُن کا شمار اُن مخلص فنکاروں میں ہوتا ہے جو گذشتہ پانچ دہائیوں سے ریا اور فریب کی جھوٹی گھٹاؤں میں آفتاب منور کی طرح چمک رہے ہیں۔ اس دوران دنیا بھر کے اخبارات، ٹی وی چینلز پر ان کے لاتعداد انٹرویوز شائع اور نشر ہوئے۔ ان کے فن و شخصیت کے حوالے سے بھی سینکڑوں مضامین شائع ہوئے۔ ان میں سے چند چیدہ چیدہ قلمکاروں کے وہ ادب پارے جو انہوں نے اپنے ممدوح کی مختلف حیثیتوں پر لکھے ہیں۔ قارئین سپوتنک کی نذر ہیں۔ یقیناً آپ انکے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے۔ اس انتخاب کا بنیادی خیال افضال شاہد مرحوم کا تھا۔ سو اس شمارہ کا انتساب بھی انہی کے نام کرتا ہوں۔

دعا گو
تنویر شاہد محمد زئی
0333-6952985
0301-6952955
tanveershahid14@gmail.com

عطاء میرا دشمن

ہرچرن چاولا

عطاء میرا بہت بڑا دشمن ہے۔کوئی آپ پر احسانات کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں چھپرتا نتا چلا جائے۔اور نہ ہی Reciprocate کرسکیں۔طرہ یہ کہ آپ اسی کی دھرتی کی پیداوار اپنے محسن کی طرح غیرت مند بھی ہوں یعنی کھال موٹی نہ رکھتے ہوں اور ناروے جیسے یخ بستہ ملک میں رہتے ہوں۔ جہاں ٹھنڈی میٹھی چھاؤں وہاں کے موسموں کی شرارتوں کی طرح سے آپ کو نہ سہاتی ہوں تو کہیے ایسا شخص آپ کا دشمن ہوا کہ نہیں۔تازہ پھول جو ابھی چند ماہ پہلے اس ظالم نے مجھ پر پھینکا ہے جو مجھے دل کی گہرائیوں تک جھنجھوڑ گیا ہے۔وہ اس کا زی ٹی وی اور ایشیا نیٹ کو دیا گیا انٹرویو ہے۔جس میں اس سے جب پوچھا گیا کہ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ میانوالی جیسے ضلع نے تمہارے جیسا عظیم فنکار پیدا کیا تو اس نے جواب دیا۔میرے ضلع نے مختلف شعبوں میں بہت سے نامور پیدا کیے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس نے قلم کے فن میں میرا خاص طور پر نام لیا۔

عطاء میرا بھائی ہے وہ عیسیٰ خیلوی میں داؤد خیلوی، ضلع ایک، وہ اب پاکستانی، میں ہندوستانی۔ ہمارے آغاز نہ ملتے ہوں۔انجام ضرور ملتے ہوں یعنی دونوں خیلوی ہیں اور آستانی بھی۔وہ پاک آستانی، میں ہند آستانی۔ایک ہی ماں کے جائے۔ایک ہی دھرتی کے پوت۔ایک ہی ہواؤں، فضاؤں اور سندھ کے پانیوں کے پلے بڑھے۔میں نے کہا ہے کہ ہمارے انجام ضرور ملتے ہیں۔ مجھے اس لفظ انجام کے لئے کوئی اور مناسب لفظ تلاش کرنا چاہیے تھا۔خیر اسے چھوڑیئے۔ایک کہانی سنیئے۔میں نے یہاں ناروے کے ایک گاؤں میں ایک چرچ دیکھا ہے جس کے ایک طرف ایک درخت ہے اور دوسری طرف دوسرا، مگر دونوں درخت اوپر جا کر چرچ کی چھت کراس کر کے گلے مل گئے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ان درختوں کے نیچے دو محبت کرنے والے دفن ہیں۔زندگی میں سماج نے انہیں ملنے نہیں دیا۔مرنے پر قبریں بھی جُدا جُدا بنا دیں۔ایک چرچ کے اس طرف، ایک دوسری طرف، مگر ان قبروں پر درخت اُگ آئے اور چھت کے اُوپر جا کر مل گئے۔عطاء بھی مجھے اخیر میں ملا ہے (خدا اُس کی عمر دراز کرے آمین) میری زندگی کی شام کو عطاء بھی پجاری ہے میں بھی پجاری ہوں۔دونوں فن کی دیوی سرسُوتی کو پُوجتے ہیں۔وہ گائیکی کے ذریعے میں قلم کے راستے۔اگر اُسے اُس کا مذہب اللہ کے علاوہ اور کسی کی پرستش سے روکتا ہو تو میں اسی بات کو یوں کہہ لوں گا کہ ان کے گلے میں سرسوتی کا باس ہے۔میں عطاء پر کوئی مضمون یا خاکہ نہیں لکھنا چاہتا۔لکھنا ہی نہیں چاہیے۔وہ دبا دب دے رہا ہے تو میں بھی دینے لگ جاؤں۔پھر تو یہ ترازو تول دکانداری ہوگئی۔محبت نہ ہوئی۔ ویسے بھی کوئی محبت ترازو پر تول کر برابر دے ہی نہیں سکتا۔آپ جتنے محبت کرنے والوں کے قصے جانتے ہیں، ہیر رانجھا، سسّی پُنوں، شیریں فرہاد، اُن کی محبت کا جائزہ لیں۔اُن میں سے ضرور کسی ایک کا پلڑا بھاری ہی ملے گا۔جان بوجھ کر نہیں، حالات کی مار سے، بے بسی کی بنا پر عطاء نے مجھے پریم ساگر میں اتنے غوطے دیئے ہیں کہ میں نہا دھو کر ''نیا نکور'' ہو کر ایک خوبصورت چرن داس نکل آیا ہوں۔میں نے زندگی میں اپنے نام کا بہت مذاق اڑایا ہے مگر اس دھلائی کے بعد یہ نام لکھتے ہوئے مجھے بڑا آنند آرہا ہے۔ہرش ہو رہا

ہے۔بس اسی آنند، خوشی اور ہرش کا حصہ دار آپ کو بنانے کے لئے مجھے یہ مضمون لکھنا پڑ گیا ہے۔ یہ عطاء کے لئے میرا اظہار محبت نہیں، وہ تو قلم کی رسائی سے باہر کی چیز ہے۔بس آپ کو اپنی محبتوں کا ساتھی بنانے کی ایک حقیر سی کاوش ہے۔ مجھے عطاء سے عقیدت ہو ہی کیوں؟ وہ کوئی فرشتہ تو نہیں، ایک عام انسان ہے۔ بالکل عام انسانوں جیسی محبت کرنے والا۔آپ کہیں گے کہ میں پھر یہ مضمون کیوں لکھ ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ فی زمانہ اگر عطاء جیسے عام انسان ملنے لگ جائیں تو یہی دنیا جنت بری کا ایک نمونہ بن جائے۔عیسٰی خیل کی دھرتی نے تلوک چند محروم جیسا بلند پایہ شاعر پیدا کیا۔جگن ناتھ آزاد کو جنم دیا۔ وہ لوگ اپنے نام کے ساتھ عیسٰی خیلوی نہ لگا سکے۔خود میں نے بھی اپنی جنم بھومی داؤد خیل پر ہمیشہ فخر کیا اور بتایا بھی۔اپنے کوائف میں جگہ جگہ اس کا ذکر بھی کیا۔اپنے آپ کو ہرچرن چاولہ داؤدنہ لکھ سکا۔ یہی حال میانوالی کے ہیرانند سوزؔ اور رام لعل کے ساتھ رہا۔چلو میں اور رام لعل تو افسانہ نگار ہیں۔ ہیرانند سوزؔ تو شاعر ہیں۔شعراء حضرات تو اپنے نام کے ساتھ اکثر اپنے شہر یا جائے پیدائش کا نام لکھتے ہیں، ملیح آباد کے چھوٹے سے قصبے کو جوش نے شہرت دی۔آج عطاء کے ساتھ عیسٰی خیل کا نام بھی یورپ تک پہچانا جاتا ہے۔ میں نے عطاء کو اس لئے پسند کیا ہے کیونکہ وہ مجھے گھی کے گڑھے ورگا سچا پٹھان لگا ہے۔ یہ کھلا اور سچّا پن میں نے اس میں اس وقت دیکھ لیا تھا جب اسے دوسری بار سُننے ناروے کے بیروم کمیون کے ایک ہال میں پہنچا تھا بے شمار لوگ اسے سُننے آئے تھے۔اس پراہ واہ کے ڈونگرے برس رہے تھے نوٹوں کی برسات ہو رہی تھی۔ڈونگرے تو وہ سمیٹتا ہوا اپنا دامن تر کئے جا رہا تھا مگر نوٹوں کی برسات سے اسے سخت اُلجھن ہو رہی تھی۔سرائیکی گائیکی اور اب اردو گائیکی کو بھی اُستادانہ فن کے ساتھ گانے والا عطاء استاد نہیں بن سکا تھا۔اس لئے جب برسات بوچھاڑ میں تبدیل ہونے لگی تو تڑپ اُٹھا تھا۔اس نے درخواستانہ انداز میں کہا تھا۔درخواستانہ اس لئے کہ سٹیج کی شہرت نے اس کے دماغ کی رگوں کو ڈھیلا نہیں کیا تھا۔اور وہ پہلے ہی کی طرح گھمنڈ اور غرور سے کوسوں دور تھا۔اس نے کہا تھا ''بھائیو اگر میرا پروگرام آپ کو بہت پسند آ رہا ہے تو دل کھول کر داد دو مگر خدارا نوٹوں کے اس جھوٹے دکھاوے سے باز آ جاؤ۔'' یہ حلم میں نے اس سے پہلی بار ملنے پر ہی محسوس کر لیا تھا جب اس نے اوسلو کے مشن ہال میں اپنا پہلا پروگرام کیا تھا۔تب چائے کے وقفے میں اس کے پاس پہنچا تھا اور سرائیکی زبان میں اس سے کہا تھا۔''عطاء بھائی میں تیرا ہم وطن میانوالی ہوں۔ میرا نام ہرچرن چاولہ ہے۔'' آہستہ آہستہ چائے سِپ کرتا، آٹھ دس گانے گانے کے بعد تھکا ہارا عطاء یک لخت تازہ دَم ہو گیا تھا۔اُس نے پیالہ رکھا اور اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔''میں جانتا ہوں ہرچرن چاولہ، تجھے اچھی طرح جانتا ہوں میرے ہم وطن اور ادیب دوست تجھے دیکھنے کی حسرت آج پوری ہو گئی۔'' اگر یہ پٹھانا نہ سچ ہے تو کل شام کا کھانا غریب خانہ پر نوش فرماؤ۔ میں نے کہا تھا۔شناء (میانوالی لفظ غالباً آشنا کا بگڑا ہوا روپ) تُو نے میرے دل کی بات کہہ ڈالی۔ میں سوچ رہا تھا کہ تم مجھے گھر پر بلاؤ تو میانوالی بھرجائی سے بھی ملاقات ہو جائے۔''اگلے دن سات بجے کا وقت طے ہو گیا تھا۔شاہِ عالم ضلع میانوالی کی میری بیوی پورینما اپنے عطاء بھائی کے لیے خاص طور پر میانوالی ذائقے کے کھانے بنائے تھے۔اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے میں نے بھی چھٹی لے لی تھی مگر قریب چار بجے عطاء کا فون آیا۔چاولہ بھائی اگر ہم چار بجے کے بجائے چھ بجے آ جائیں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا۔وہ دراصل منتظم نے ایک جگہ گانے کا پروگرام رکھا ہے۔

'' جی صدقے آپ کا اپنا گھر ہے جب جی چاہے آؤ۔'' ساتھ ہی اس دن ایک ضرب المثل '' دھیلے کی ہنڈیا گئی.....'' بھی صحیح ثابت ہو گئی تھی۔آپ چونکیئے نہیں۔یہ کسی اور کی کہانی ہے۔میرے ایک دوست تھے ملتانی رام۔ہمارے ہاں ہماری طرف سے ہر ادبی اور سوشل محفل میں ضرور مدعو کئے جاتے تھے۔میں نے سوچا وہ بھی آجائیں۔فون کیا۔پروگرام بتایا تو بولے۔''سوری! میں نہیں آسکوں، ارے! بھائی۔یہ لوگ کسی کے ہاں کھانا کھانے نہیں آتے۔گانا گاتے آتے ہیں۔اور جانتے ہو ان کے ایک شام کے چارجز کیا ہوتے ہیں۔پانچ ہزار کرونز''۔''دیکھئے پہلی بات تو یہ کہ میں نے اسے گانے کے لئے نہیں، کھانے کے لئے بلایا ہے اور اگر پیسے دینے بھی پڑ گئے تو میں نے ہی بلایا ہے میں ہی دوں گا۔آپ کو کس بات کی فکر ہے۔''میں نے کہا گانا سنا تو کچھ دینا بھی پڑے گا۔وہ بولے۔''ٹھیک ہے تم جو سو پچاس دو گے۔وہ بعد میں تمہیں میں ادا کر دوں گا۔'' '' نہیں مجھے معاف کیجئے۔میں نہیں آسکوں گا۔وہ بولے۔میں جلدی جلدی بینک پہنچا اور پانچ ہزار کرونز جیب میں ڈال لایا مگر ان کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔وہ دن اور آج کا دن ہمارے اور ملتانی کے درمیان ایسی خلیج ہوئی جو آج تک پُر نہیں ہوسکی۔عطاء آیا۔اس کے ساتھ تین سازندے اور منتظم تھے۔کھانے کے بعد سرائیکی زبان میں باتوں کا دور چلا تو جیسے گھڑیاں تھم گئیں مگر منتظم کی گھڑیاں تو فل سپیڈ پر دوڑ رہی تھی۔وہ میز کے نیچے سے عطاء کی ران پر بار بار ہلکی سی تھاپ دے دے کر اُسے بھاگتے وقت کی آگاہی دیتا مگر عطا لاپرواہی سے بولا۔''ہو جائے گا وہاں کا پروگرام بھی۔'' اور پھت لطیفوں اور گپوں کی پتھر مار میانوالوی دنیا میں گم گیا۔ہاں اگر دو میانوالوی بول رہے ہوں تو لگتا ہے جیسے پتھر برسا رہے ہیں یا پتھر ٹکرا رہے ہیں۔جن کے ٹکراؤ سے ہنسی کے فوارے پھوٹتے ہیں۔ماحول ایسا خوشدلانہ ہو تو کوئی بھی کچھ بھی، کسی بادشاہ سے مانگ سکتا ہے اور پورینما نے بادشاہ موسیقی سے مانگ ہی لیا۔ عطاء بھائی! آپ کا ایک گانا ہے بنوں دی مہندی۔مجھے بہت پسند ہے۔کہاں سے مل سکے گا۔''میرے گانوں کے بہت سے کیسٹ آچکے ہیں۔ایک کیسٹ میں یہ گانا بھی ہے۔لندن سے دستیاب ہو سکے گا۔'' تھوڑی دیر بعد منتظم نے پھر عطاء کی ران پر تھاپ دی ۔عطاء سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ میں کیا کہہ بیٹھا ہوں۔وہ پورینما سے بولا۔ بھرجائی (بھابھی) میں بھی عجیب پاگل ہوں۔ بہن کے گھر بیٹھا ہوں۔خدمت کروا رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ کیسٹ لندن سے ملے گا۔''وہ فوراً سازندوں کی طرف مڑا۔جاؤ اوئے باہر گاڑی سے طبلہ اور جوڑی اٹھالاؤ۔منتظم کے چہرے کا رنگ بدلا۔عطاء نے اس سے آنکھ تک نہ ملائی۔پورینما سے بولا۔''بہن! بیٹھنے کا بندوبست کرو۔'' پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔چاولہ بھرا (بھائی) نزدیک کوئی دوست احباب ہوں تو انہیں بھی بلوالو۔ذرا رونق میلا ہو جائے گا۔پورینما نے صوفہ ایک طرف سَرکا دیا۔دو راجستانی دریاں بچھا کر ان کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا۔میں نے دو چار دوستوں کو بُلایا۔قریب کیسٹ ریکارڈ رکھ دیا۔عطاء نے ہارمونیم سنبھالا۔ایک سازندہ طبلوں کی جوڑی پر بیٹھا اور عطاء گانے لگا۔''بنوں دی مہندی چٹے چٹے ہتھاں اتے رنگ ماہیا''۔وقت اڑ رہا تھا۔ منتظم اڑ رہا تھا، منتظم کے چہرے پر کئی رنگ آرہے تھے، جارہے تھے مگر کیسٹ پر پورے چار گانے ریکارڈ ہو چکے تھے۔وہ لوگ اپنے اگلے پروگرام سے ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو چکے تھے۔کافی عرصہ بعد اوسلو کے راک فیلر ہال میں عطاء کا دوسرا پروگرام تھا۔ اس دن کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں پروگرام کرنے کے بعد تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ پہنچا تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔لوگ بے صبری سے شور مچا رہے تھے۔وہ آیا مسکرایا۔

سب مسکرائے اور مفتوح ہو گئے۔ پروگرام کے اختتام پر اس سے ملنے آٹو گراف لینے اور مصافحہ کرنے کے شوقین عورتیں اور مرد سٹیج کی طرف دوڑے۔ مجھے دیکھ کر وہ لپک کر میری طرف آیا اور مجھے گلے لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک حسینہ ہتھیلی پر آٹو گراف لینے کو ہاتھ آگے کئے کھڑی تھی۔ کچھ لوگ میرے ذریعے متعارف ہونے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ سب سے بے خبر اور لاپرواہ جھپی ڈالے ہوئے کھڑا تھا۔ عطاء پاکستانی ایمبسی کے ناظم الامور خضر حیات نیازی کے ہاں مقیم تھا۔ ایسے فنکار کو چھپا کر کیسے رکھا جا سکتا ہے۔ نیازی صاحب نے فہرست ایک عطاء کے آگے رکھ کر پوچھا۔ آپ کسی کو بُلانا چاہیے تو بتا دیجئے۔ عطاء نے بنا دیکھے فہرست ایک طرف سَرکا کر کہا۔ ''میری طرف سے ایک ہرچرن چاولہ کو بُلا لو۔'' نیازی صاحب نے فہرست سامنے دھر دی دیکھ لو یہ نام فہرست میں سب سے اُوپر ہے۔ اس محفل میں میرے ساتھ ہندوستان سے تشریف لائے میرے بھائی ہربنس لال چاولہ بھی تھے۔ ہمیں اور چند قریبی دوستوں کو کچھ دیر پہلے بُلا لیا گیا تھا۔ بڑے بھائی کچھ زیادہ چڑھائے ہوئے تھے۔ شروع ہوئے تو سارا جہان پیچھے اور وہ آگے۔ ''ارے شنا عطاء تو اب تک کہاں تھا۔ اوئے میرے میانوالی دی دھرتی دا پتر۔ میرے شہر نے ایسا ہیرا پیدا کیا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ اوئے تو نے سونے کا دانہ کہاں چھپا پڑا تھا۔ تیری ماں مل جائے تو میں اس کے پاؤں دھو دھو کے پیئوں۔ جس نے تجھے جنم دیا۔ اوئے عطاء تو میری عمر بھی لے لے اوئے۔'' بزرگ بھائی۔ میں روکوں تو کس طرح۔ عطاء ہنسا، بولا۔ بھرا تو نے بہت سُنا لیا۔ اب مجھے بھی سُنانے دے۔ '' سُنا یار سنا! تجھے کون روکتا ہے مگر یہ تو بتا اب تک کہاں چھپا پڑا تھا بس تو میری عمر لے لے۔ میری سانسوں سے ہوا بدبودار ہو رہی ہے تو میری باقی سانسیں لے کر انہیں خوشبودار کر دے۔ یار! تو اب تک کہاں تھا۔ میں مکیش رفیع اور تیرے گانوں کا عاشق ہوں۔ کتنا خوش قسمت ہوں کہ آج تیرے درشن بھی کر لیے۔ بس اب ایک حسرت ہے اپنی ماں کے درشن کرا دے۔

میں اسے دیوی کی طرح پوجوں گا۔ جس نے عطاء جیسے فنکار کو جنم دیا ہے۔ تو وہ پھول ہے جس کی خوشبو سارے یورپ تک پھیل رہی ہے۔ تو وہ سورج ہے جو آسمان کے سورج سے آنکھیں ملا رہا ہے۔ یار تو میری بھی عمر لے لے۔ تیرے مقابلے میں بہت فضول سی زندگی ہے۔ میری اوئے۔ اب تک بہت سے لوگ آ چکے تھے اور عطاء کے گانے کے منتظر تھے مگر بھائی صاحب باری دیتے تو وہ گاتا۔ بھائی صاحب پھر رواں ہوئے۔ عطاء تو میری زندگی .....'' بہت ہو لیا۔ ایک صاحب اٹھے۔ بھائی صاحب کی بانہہ پکڑی بولے اٹھو چاولہ صاحب۔ زندگی میری بھی فضول سی ہے۔ باہر چل کر اکٹھے جھیل میں کود جائیں۔ عطاء کو گانے دیں۔ یہ سب لوگ بڑی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔ بھائی صاحب ہوش میں آئے غلطی محسوس کی۔ ہتھیلی اپنے منہ پر رکھی اور چپ ہو گئے۔ پروگرام شروع ہوا۔ گاہے بگاہے بھائی صاحب کی ہتھیلی منہ سے ہٹ جاتی تو پھر شروع ہو جاتے۔ واہ عطاء بھائی واہ۔ خوش رہو زندہ رہو۔ ہندو ہوں پر جنم پر یقین رکھتا ہوں آج سچے دل سے بھگوان سے دعا مانگتا ہو ں کہ میری سب زندگیاں تمھیں عطا کر دے۔

شرارت کا پانی لوگوں کے ہوش اُڑا دیتا ہے مگر بھائی صاحب کا ہوش اخیر تک قائم رہا ڈسٹرب تو کرتے رہے لیکن مجال ہے کہ کوئی اخلاق سے گری ہوئی بات کی ہو یا عطاء کی شان میں گستاخی کی ہو۔ ایک سے بڑھ کے ایک خوبصورت فقرہ اچھالتے رہے۔ پروگرام رنگ پر آیا تو پھر نوٹوں کی برسات ہونے لگی۔ عطاء نوٹوں سے بے نیاز جھوم جھوم کر گاتے رہے۔ نوٹ برستے رہے وہ

گاتے رہے۔ میں نے بھی اخیر میں سو کرونز کا نوٹ پیش کیا۔ وقفہ ہوا تو عطاء نے میرا نوٹ اٹھایا۔ بازغہ بھابھی کو بلایا۔ یہ چاولہ صاحب کا نوٹ ہے اسے خرچنا نہیں ہے۔ ایک تعریفی تمغے کے طور پر فریم کروا کر گھر میں رکھیں گے۔'' عطاء لاہور سے اپنے گانوں کے صرف دو سی ڈی لایا تھا۔ نوٹوں کی برسات کرنے والے دیکھتے رہے۔ اس نے ایک مجھے بھی تھما دیا اور ایک نیازی صاحب کے حوالے کر دیا۔ کھانے کی میز پر پلیٹ اٹھائے میرے پاس آیا۔ پوچھا۔ ہر چرن کیا مجھے گھر پر نہیں بلائے گا؟ نہیں! میں نے یونہی سا روکھا جواب دیا۔ کیوں کوئی بھول چوک ہوگئی ہے مجھ سے۔ یار معاف کر دو وہ بولا۔'' کیوں شرمندہ کرتے ہو۔'' میں نے کہا بیوی چل بسی ہے چولھا چوکھا مجھے کرنا آتا نہیں۔ اچھی طرح خدمت نہ کر سکا تو میرا دل دکھے گا۔'' یار تم بلاؤ تو سہی جو کچھ دو گے چوم چاٹ کر کھا لیں گے۔'' تو پھر کل ہی آؤ۔ خوش آمدید۔ میں نے کہا۔ اس رات عطا نیازی صاحب کے ساتھ رات دس بجے غریب خانے میں آیا اور صبح چار بجے واپس گیا۔ فروری ۱۹۸۸ء ہی میں اور پورینما پاکستان گئے۔ لاہور، ربوہ، وزیر کوٹ، سرگودھا، میانوالی سے ہوتے ہوئے معروف سرائیکی شاعر محمد سلیم احسن کے ساتھ داؤد خیل اور کالا باغ پہنچے۔ اسی شام واپس میانوالی آئے تو سلیم نے بتایا کہ میانوالی کے اہلِ فن و ادب نے شہر کے بڑے شہزاد ہوٹل میں میانوالی اکیڈمی کی طرف سے ایک ہال بک کر رکھا ہے جس میں میرے اعزاز ایک استقبالیہ جلسہ ہوگا۔ ہم کافی لیٹ ہو گئے تھے۔ سب تیز قدموں سے ہال کی طرف دوڑے مگر مجھے راستے میں ہی ایک کمرے میں روک لیا گیا۔ جہاں چھ سات لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں سب سے گلے ملا۔ ہاتھ ملائے مگر ایک شخص نہ ہی گلے ملا نہ ہی مصافحہ کرنے کو ہاتھ بڑھایا۔ وہ نخرہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر گلے لگا لیا وہ شخص یہ دیکھنے کو رکا تھا کہ اسے پہنچانتا بھی ہوں کہ نہیں مگر میں نے اسے پہنچان لیا تھا۔ اسی لیے تو اتنے زور سے گلے لگا لیا تھا۔ وہ عطاء اللہ خان خیلوی تھا۔ اپنی آواز میں بلا کا درد اور جادو رکھنے والا مشہور معروف پاکستانی گائیک جسے بجا طور پر سفیر کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی ڈیڑھ سالہ بیمار بیٹی اور بیوی کے ساتھ عیسیٰ خیل سے لاہور جا رہا تھا۔ وہ چند منٹوں کے لئے میانوالی کسی دوست کے ہاں رکا تھا کہ اچانک اس کی نظر میز پر پڑے شام کے جلسے کے کارڈ پر پڑ گئی اور وہ مجھے ملنے کو رک گیا۔ وہ تقریباً دو گھنٹوں سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے ملنے کے بعد اپنا لاہور کا ایڈریس کارڈ دیتے ہوئے بولا۔ بھرا اب اجازت چاہتا ہوں۔ ضرورر کتا مگر بیٹی بیمار ہے اسے علاج کے لئے لاہور لے جا رہے ہیں۔ بیوی بھی ساتھ ہے۔ لاہور آؤ تو مجھے فون کر دینا آ کر لے جاؤں گا۔ ملے بغیر مت جانا۔'' میں بھی چاہتا تھا کہ وہ نہ رُکے کیونکہ اگر وہ رک جاتا تو وہ جلسہ اس کا ہو جاتا۔ ضلع میانوالی (اور اب تو ساری دنیا میں) مقبول ہو چکا تھا کہ اس کے سامنے وہاں اور کوئی فنکار نہ ٹک پاتا میانوالی سے راولپنڈی اسلام آباد ہوتے ہوئے واپس لاہور پہنچتے ہی میں نے اپنی قیام گاہ (ڈاکٹر وزیر آغا کا گھر) سے حسب وعدہ عطاء کو فون کیا تھا۔'' میں ابھی آپ کو لینے آ رہا ہوں۔ اس کی آواز میں جلدی سے جلدی اغوا کر لینے کی بے چینی عیاں تھی۔ پندرہ ہی منٹ بعد وہ ہمارے دروازے پر کھڑا ہارن بجا رہا تھا۔ میانوالی بے صبری اس کی ہر بات سے ظاہر ہو رہی تھی۔ آغا صاحب کے بیٹے سلیم آغا قزلباش سے علیک سلیک کے بعد اس نے مجھے اور پورینما کو کار میں بٹھایا اور اُڑ چلا۔ اس کا گھر پندرہ منٹ کی دوری پر تھا۔ ایک ٹریفک سگنل پر کار رکی تو ایک بھکارن کھڑکی پر آ کر بھیک مانگنے لگی۔ ایک خانے میں عطاء نے ریزگاڑی اور نوٹ اسی مقصد کے لئے رکھے ہوئے تھے اس نے ایک نوٹ بھکارن کو تھما دیا۔ علامہ اقبال ٹاؤن

میں عطاء اللہ کا گھر ایک خوبصورت کوٹھی میں تھا۔ چار سال کا بیٹا سانول اور ڈیڑھ سال کی لاریب۔ بیوی بازغہ کبھی فلموں اور کبھی ڈراموں میں کام کرتی تھی تقریباً بیس فلموں میں ہیروئین آچکی ہیں۔ ٹی وی سیریل وارث، احساس وغیرہ میں کام کر چکی ہیں۔ ٹینا میں بہترین اداکاری پر اسے نگار ایوارڈ ملا تھا۔ عطاء کے پیار نے سب کچھ چھڑا دیا اور وہ بازغہ عطاء بن کر گھر اور بچوں کے لئے وقف ہو گئیں۔ چائے کے بعد بازغہ نے پوچھا۔ چاولہ بھائی۔ بولو کیا کھانا پسند کریں گے؟ بس سادہ دال روٹی ہی اور دال روٹی کا مطلب دال روٹی ہی ہے تو ضد بازی میں پیورو تیکبیٹیرین ہوں۔ شاید بازغہ کو اپنی فلم ''ضد بازی'' کی کوئی سچویشن یاد آ گئی تھی۔ بولی۔ اچھا ضد نہیں کروں گی۔ صرف ایک سبزی اور بنا دوں گی۔ بھنڈی توریاں پڑی ہیں۔ آپ کو پسند ہیں؟ بس بس پھر تو موج ہو جائے گی۔ میں نے جواب دیا۔ اتنی بڑی ہیروئن جس کے ہاں کبھی کبھی نوکروں کی فوج رہی ہو گی۔ میرے لیے اب اتنی محبت سے خود اپنے نازک ہاتھوں سے توریاں کاٹ رہی تھی۔

فی زمانہ زندگی گزارنے کے لئے انسان کو بہت سی زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں مگر ایک زبان جو اپنے اندر ہی پھوٹتی ہے وہ ماں بولی ہے۔ جو بِنا تھکے گھنٹوں بلکہ دنوں تک بولی جا سکتی ہے۔ دوسری اظہار کی زبان ہوتی ہے اور تیسرے نمبر پر ضرورت کی زبانیں آتی ہیں۔ اظہار کی زبان بے حد گہری سوچ اور سمجھ کی متقاضی ہوتی ہے۔ دوسری زبانیں ضرورت کی مجبوری ہوتی ہیں۔ اس لیے انہیں بولتے ہوئے ڈبل محنت کی جاتی ہے۔ انسان پر جلد تھکاوٹ طاری ہو جاتی ہے۔ عطاء اور میری ماں بولی ایک ہے اس لیے وقت پَر لگا کر اڑتا جا رہا تھا۔ مجھے اور بھی بہت سے لوگوں سے ملنا تھا۔ دو تین پروگراموں میں بھی خاص طور پر مدعو تھا مگر عطاء کی باتوں کا خزانہ تھا کہ لٹتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ادھر بازغہ اکیلی ہی کچھ زیادہ ہی کر ڈالنے میں مصروف تھیں۔ عطاء کے چہرے پر رات تین چار بجے تک کئے گئے پروگرام کی تھکاوٹ کی جھلک اٹھتی تھی مگر باتیں کرتے ہوئے وہ پھر تازہ دم ہو اٹھتا تھا۔ لاہور کے پنجابی ماحول میں نارویا ور دہلی سے آ کر سرائیکی بولنے والا اس کا ہم وطن آج اس کین ہاتھ لگ گیا تھا۔ سو اسے کیسے اتنی آسانی سے چھوڑ دیتا۔ کھانا بے حد لذیذ تھا۔ دراصل ہر فن انتہائی محنت اور توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ محنتی آدمی کو اگر ایک فن سے ہٹا دیا جائے تو اس کی محنت کی عادت کسی دوسری طرف مرتکز ہو کر اپنا کوئی اور راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ بازغہ نے اپنی فنکاری کا تمام تر زور گھر، میاں، بچوں اور ان کے لئے لذیذ کھانے بنانے کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ میری نظر ڈرائنگ روم میں شیلف پر سجی انعامات اور ٹرافیوں کی طرف گھوم گئی جو گواہ تھے کہ عطاء اپنے فن میں اب درجہ کمال کو پہنچ چکا ہے۔

بچہ نظروں ہی نظروں میں پیار کی زبان پڑھ لیتا ہے۔ سانول میری گود میں بیٹھا تھا۔ وہ مجھ سے جلد ہی گھل مل گیا تھا۔ ایک شرمندگی سی میرے اندر ضرب لگانے لگی تھی۔ میں خالی ہاتھ ہی وہاں آ گیا تھا۔ کیا کرتا عطاء بھائی نے مہلت ہی نہیں دی تھی۔ ہمیں جانے کی بھی جلدی تھی۔ کئی جگہوں پر جانا تھا۔ کئی لوگوں سے ملنا تھا۔ میں نے عطاء کو ایک خاص ڈھنگ سے گھیرا۔ عطاء بھائی میرا ایک کام کرو گے؟ میانوالی انداز سے چھاتی پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ''حکم'' تو سنو یہ ایک بڑے بھائی کا حکم ہے۔ میں نے سو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''سانول کو ٹافیاں دلوا دینا''۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ اب نہ نہیں کر سکے گا۔ ہزاروں روپے لینے والے گائیک نے نہایت

پیار اور خلوص سے میرا نوٹ قبول کر لیا۔ ''مگر چاولہ بھائی میں نے آپ کو کچھ بھی پیش نہیں کیا۔ ایک گائیک کے گھر سے کم از کم اس کے گانوں کے کیسٹ تو آپ کو ملنے چاہیے۔''

اور بھی تازہ واقعہ ہے گئے سال ۱۹۹۵ء صبح سویرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ادھر سڈنی (آسٹریلیا) سے میری چھوٹی بیٹی پینو بول رہی تھی۔ وہ اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ وہیں سیٹل ہے۔ بڑی بیٹی بھی اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ وہیں رہتی ہے۔ بولی ''پاپا۔ ابھی شام کو (آسٹریلیا کا وقت ناروے سے نو گھنٹے آگے ہے) عطاء اللہ خاں کے گانے کے پروگرام پر جا رہے تھے۔ وہ ممی اور آپ کے ضلع میانوالی کے ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ آپ کی بولی سرائیکی سننے کے لئے انہیں گھر پر بلاؤں۔ مگر سوچتی ہوں کہ وہ آئیں گے؟'' ''ضرور آئیں گے انہیں صرف اتنا کہنا کہ میں ہرچرن چاولہ کی بیٹی ہوں۔'' دوسرے دن دفتر پہنچا تو کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی ریسیور اٹھایا۔ ادھر سے پینو بول رہی تھی۔ ''پاپا عطاء بھیا سے بات کرو۔'' دیکھا دشمن جاں کہیں بھی نہیں بخشتا۔

(بیروم زوک ناروے مورخہ ۲۵ دسمبر ۱۹۹۶ء)

بین الاقوامی جمالیاتی اُفق اور عیسیٰ خیلوی

ڈاکٹر خیال امروہوی

فنون لطیفہ میں مجسمہ سازی، مصوری، موسیقی اور شاعری اہمیت رکھتے ہیں۔ مجسمہ سازی انسانی شخصیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ مصّوری قوسوں اور رنگوں کے ذریعے مناظرِ فطرت، جمالیات، انسانی وجدان، مادی مسائل کی نمائندگی کرتی ہے۔ موسیقی روح میں تواجد، شگفتگی، غم و یاس اور خوشگوار یادوں کی تخلیق کا سبب یا ذریعہ ہے لیکن شاعری تمام فنون لطیفہ میں اعلیٰ معیار کا فن کہلاتا ہے۔ شاعری میں شخصیت کی نمائندگی، رنگوں کی برسات، ساز و آواز کے لشکارے اور لفظوں کی وساطت سے انسانی دل و دماغ میں کھٹک اور دھنک پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے آگے بڑھانے اور اس میں گہرا تاثر پیدا کرنے کے لئے موسیقی ہی کو دیکھیں۔ جب ہم درباری یا پیلوراگ سنتے ہیں تو ہمارے حواس اور وجدان پر ماضی کی یادوں کی یلغار ہوتی ہے۔ شہنائی کو سننے کے سے بیتے لمحات، محبت بھرے زمانے، امن و سکون کی پرچھائیاں دل و دماغ پر اثر کرنے لگتی ہیں۔ اس لیے ہر تمدن اور ہر علاقے کا شاعر، مصور، موسیقار اپنے اپنے عہد کی روایات، ثقافت اور مجلس مطالبات و تقاضوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ایک ایسے علاقے سے اُبھرے جو شہری زندگی سے دور ہی کہلا سکتا ہے لیکن اس علاقے کی اپنی زبان، اپنی ثقافت اپنی بود و باش ہے۔ اس علاقے کی انسانی جمالیات دوسرے علاقوں سے مختلف ہے۔ یہاں دل و وجدان کے معاملات نہایت سادہ، خلوص و وفا سے معمور رہے ہیں۔ ہجر و وصال کہاں نہیں ہیں لیکن جو درد، محرومی، حزن و ملال اس علاقہ کی شاعری میں موجود ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہے، نیچرل ہے، لہٰذا یہاں کی شاعری اور موسیقی کو بھی پاکستان کے دیگر علاقوں سے مختلف، نمایاں اور ممتاز کہنے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی نے کلاسیکی موسیقی اور جدید موسیقی کے بنیادی خصوصیات اور اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے سرائیکی علاقے کی قدیم موسیقی اور جدید

موسیقی کے امتزاج سے حیرت ناک طور پر عظیم فن تخلیق کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان کی گائیکی محض علاقے تک محدود نہیں رہی بلکہ بین الاقوامی جمالیاتی اُفق کو بھی شفق رنگ بنا رہی ہے۔ انسانی درد ایک آفاقی قدر ہے اس کا تعلق صرف ایک علاقے یا مخصوص تمدن سے نہیں بلکہ انسانی درد، لطیف حسیات کا جزو اعظم کہلاتا ہے۔ ہر چند مشرق، مغرب، جغرافیائی اعتبار سے متضاد سہی لیکن انسان ہر جگہ رہتا ہے اور جہاں انسان ہے وہاں وہ موجود ہے اور جہاں درد ہوگا وہاں موسیقی بھی ہوگی اور جہاں موسیقی ہوگی وہاں درد کا سفیر بھی ہوگا اور وہ سفیر عطاء اللہ ہی ہوسکتا ہے۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی سے ہر دردمند انسان پیار کرتا ہے کیونکہ وہ ہر دردمند کا نمائندہ ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ سرائیکی زبان پر مکمل عبور نہ ہونے کے سبب عطاء اللہ کے گانوں کے بول تو میں نہ سمجھ سکا لیکن لفظوں کے ساتھ درد بھری موسیقی کی بارش اور لب و لہجے کی مسلسل و متواتر شبنم افشانی نے مجھے شرابور اور آنکھوں کو اشکبار کر دیا۔ عطاء اللہ کے بعض گانے تو ایسے ہیں جو مجھے میرے عہدِ جوانی میں لے جاتے ہیں اور وہاں سے مجھے میرے بچپن میں داخل کر دیتے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عطاء اللہ کی موسیقی کے اڑن کھٹولے پر بیٹھا ۱۹۴۰ء کے دور میں داخل کر دیتے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جہاں معصومیت، وجدان اور خلوص و وفا موجود تھے۔ ''زمانوں کے عذاب سے ماورا زمانہ'' اور یہی خصوصیت ہے جو عطاء اللہ کی گلوکاری قدیم و جدید کے امتزاج سے تشکیل شدہ جدید موسیقی میں موجود ہے۔ لتا منگیشکر کی موسیقی شبنم برساتی ہے، عطاء اللہ لی موسیقی دل و دماغ میں گلاب اور سورج مکھی کھلاتی ہے۔ لتا کی موسیقی مجسم درد ہے۔ عطاء اللہ کی گائیکی کونجوں کی کرلاہٹ اور کوئل کی پکار ہے۔ عطاء اللہ کی موسیقی سُن کر نہ جانے کیوں اس ملک کے لاکھوں بدنصیب محروم و مہجور لڑکے اور لڑکیاں پرچھائیاں بن کر میرے دل و دماغ پر مسلط ہونے لگتی ہیں؟ کیا واقعی اس طبقاتی نظام والے ملک میں ہجر و وصال کے ایسے ہی شدید عذاب اور خوفناک خواب موجود ہیں۔ جن کی عطاء اللہ نمائندگی کرتے ہیں اس سوال نے ہمیشہ مجھے پریشان کیا بلکہ یقین ہوگیا کہ انسانی مظالم محض مال و دولت تک محدود نہیں بلکہ انسانی دلوں ی خواہش اور آرزؤں کے بھی قاتل ہیں لہٰذا سزا کے طور پر ایسے انقلاب کی ضرورت ہے جو ان تمام ظالموں کو تہس نہس کر دے جو انسانی جمالیات، ذاتی پسند باہم زندگی گزارنے کے نیچرل تقاضوں پر بھی طبقاتی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ عطاء اللہ خان نے علاقائی انقلابی سپرٹ کو آگے بڑھانے اور موسیقی کی وساطت سے دلوں میں انقلابی محاذ قائم کرنے میں عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے بلکہ وہ اس محاذ کے تاریخی کمانڈر ہیں۔ عطاء اللہ خان سے میری ملاقات ۱۹۸۹ء میں لیّہ میں ہوئی تھی۔ جب موصوف سانول سنگت کے زیر اہتمام منعقدہ عظیم جشن موسیقی میں تشریف لائے تھے اور انہوں نے ازراہ قدردانی مجھے ''شاعر انقلاب'' کا ایوارڈ برائے ۸۹ء عطاء فرمایا تھا۔ اُمید تھی کہ موصوف نے جہاں دیگر شعراء کے موصوف نے جہاں دیگر شعراء کے کلام کو ساز و انداز کے ذریعے دوسروں تک پہنچایا۔ غالباً میری آواز کو بھی اپنی آواز اور لہجے کے اعتبار سے شائقین تک پہنچا سکتے تھے لیکن یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اسے میں اپنے کلام کی کوتاہی سمجھتا ہوں کہ وہ زیادہ عوامی نہیں ہے جبکہ عطاء اللہ عوامی فنکار ہین۔ اس اعتبار سے غالب اور اقبال بھی عوامی شاعر نہ تھے ان کا کلام بھی آج تک کسی نے ڈھنگ سے نہیں گایا بلکہ موسیقی کا کوئی رنگ بھی ان کے کلام کا احاطہ نہ کرسکا۔ یہی حال کچھ اپنے ساتھ بھی ہے۔ جس کا شکوہ بے سُود ہے۔

عطاء اللہ خان اور ماہیا

سیّد نصیر شاہ

سرائیکی زبان شاعری میں بڑی مالدار (Rich) ہے۔اس کے پاس لوک ادب کا بڑا ذخیرہ ہے جو ماہیا کی صورت میں تھل کی فضاؤں میں آنسوؤں اور آہوں کی ٹھنڈکیں گھولتا رہتا ہے۔ ماہیا وہ صنف شاعری ہے جس پر زبان کی شاعری قربان کی جاسکتی ہے۔احمد ندیم قاسمی کا یہ قطعہ جب بھی پڑھتا یا سنتا ہوں میرے دل کے سارے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔

گلی کے موڑ پہ بچوں کے ایک جھرمٹ میں
یہ کس نے درد بھری لَے میں ماہیا گایا
مجھے کسی سے محبت نہیں مگر اے دوست
یہ کیا ہوا دل بے قرار بھر آیا

ماہیا سچّی شاعری.....نام ونمود اور خواہش تشہیر کی آلودگیوں سے پاک، کس نے کہا، کس نے لِکھا۔

دل نے کہا، جگر نے لکھا، آنسو لفظ بنے، آہوں نے دھن ترتیب دی اور زخمی ہواؤں نے گایا، فضاؤں نے سنا اور ایتھر کی موجیں نشر کرتی گئیں۔ میں سمجھتا ہوں سرائیکی زبان پر اللہ نے دو بڑے احسان کئے۔ایک ماہیا اور دوسرا عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی.....ماہیا نے سرائیکی شاعری کو وجود دیا۔ساری سرائیکی شاعری ماہیا کے بولوں کی ہی ترجمان ہے۔کوئی بول ''کافی'' کی تخلیق کا سبب بن کر پھیل گیا۔تفصیل واطناب میں آ گیا.....کوئی تھوڑا پھیلا، تھوڑا سکڑا اور ''دوہڑے'' کی صورت اختیار کر گیا۔کہتے ہیں غزل کا سب سے بڑا وصف اختصار اور جامعیت ہے کہ شاعر کو وسیع خیال دو لائنوں (مصرعوں) میں سمیٹنا پڑتا ہے مگر ماہیا اس سے بھی آگے کی چیز ہے کہ پورا خیال ایک ہی لائن میں آجاتا ہے یوں سرائیکی غزل اور سرائیکی گیت بھی ماہیا ہی کے ہفت رنگ بلکہ ہزار رنگ پہلو ہیں۔ ماہیا کی لے بھی ہزار پہلو ہے شُتر بان ''ماہیا'' کے سہارے تھل کا سفر طے کرتے ہیں تو ماہیا کی تان ''حدی'' کے سُروں سے جا ملتی ہے اور اونٹ مست ہو کر رفتار تیز کر دیتے ہیں۔ چرواہا ''ماہیا'' کے وہی بول گاتا ہے تو لَے میں اُس پکار کا رنگ آجاتا ہے۔جس میں بچھڑے ہوؤں سے التجا کی جاتی ہے کہ واپس لوٹ آئیں اور بھیڑ بکریاں ممیاتی، ممناتی دوڑتی آتی ہیں اور اکٹھی ہونے لگتی ہیں اور اگر ان وہ بھی یہ سُر سُن لے تو یقیناً واپس آجائے گا جسے چرواہا پکار رہا ہے۔ رہٹ اور کنوئیں پر بیٹھا وہ ماہیا کے وہی بول اُن سُروں سے ہم آہنگ کر لیتا ہے جو چلتے رہٹ کے مختلف اجزاء سے پیدا ہونے والی آوازوں سے اُبھرتے ہیں اور جن کے سازوں میں رہٹ کھینچنے والے جانور کے قدموں کی آواز طبلے کی تھاپ کا کام دے رہی ہوتی ہے باجرے کی راکھی کرنے والا ماہیا کے بول لاپتا ہے تو اس تان میں وہ گنجار بھر جاتی ہے جس سے پرندے تو خائف ہو جاتے ہیں مگر کسی سے ''بھاگ بھری'' کے دل میں اُمنگیں ٹھاٹھیں مارنے لگتی ہیں کہ کسی کی دوپہر کی تنہائیوں اُسے آغوش میں بھر لینے کے لئے بے چین ہیں۔ ماہیا گھاس چارہ اکٹھا کرنے والوں، ہل چلانے والوں اور کشتیاں کھینے والوں کے لبوں سے

نکلتا ہے تو لَے اور سُر میں ان کے کام کو اُٹھان دینے والی تانیں لہراتی ہیں.....ادھر ترنجن میں پہنچتا ہے تو اس کے سُر چرخے کی دھیرے دھیرے بہتی سسکیوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں اور ''پہاڑوں'' میں جاتا ہے تو گھومتی چکیوں کی پہاڑی ندیوں جیسی گھر گھراتی اور راستہ پوچھتی صداؤں سے آمیخت ہو کر پیاری صبحوں کو بُلانے لگتا ہے.....ماہیا کے اتنے رنگ اور ان رنگوں کی ترنگوں کے سارے اعجاز عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز میں قدرت نے سمو دیئے ہیں اور اس نے ساری دنیا میں پہنچا دیا۔ فضائیں لبریز ہو گئیں، آفاق بھر گئے۔ مشرق اور مغرب کا ہر گوشہ برآواز ہو گیا۔ یوں سرائیکی زبان چھا گئی اور چھاتی چلی جا رہی ہے۔ انگریز اسے سمجھے یا نہ سمجھے۔ عطاء اللہ خان کی آواز اور سرائیکی شاعری کے مخصوص اور منفرد سُر اُسے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں.....عطاء اللہ خان ایک تحریک کا نام ہو گیا اور اس تحریک نے سرائیکی علاقہ کے گلی محلوں میں بے انتہا گلوکار پیدا کر دیئے۔ سرائیکی شاعری خواجہ فرید کے بعد بھی ایک جوئے نغمہ خواں کی طرح رواں تو تھی مگر دواں نہیں تھی۔ قدم سست تھے اور رفتار دھیمی پھر اچانک لوگ اپنی تلاش میں نکل پڑے۔ اپنے چہرے ڈھونڈنے لگے۔ اپنی پہچان اور اپنی شناخت کی جستجو میں سرگرداں ہوئے اپنی اور اپنوں کی آوازیں۔ دوسری آوازوں کے سمندر سے نتھار کر الگ کرنے میں سرگرم ہو گئے۔ یہ ریلا کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ یہ الگ باب ہے۔ جس کا بہر حال عنوان عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ہے۔

درد کا سفیر

پروفیسر منور علی ملک

درد بھری سُریلی آوازیں، ہمیشہ میری کمزوری رہی ہیں۔ لوک گلوکاروں میں سب سے زیادہ عطاء کی آواز نے متاثر کیا اور خوش قسمتی سے ایک عرصہ تک اس کا قرب بھی میسر آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عطاء کا تعارف میانوالی میں بھی گنے چنے لوگوں تک محدود تھا مگر یقین کیجئے میرا دل اُس وقت بھی یہ گواہی دیتا تھا کہ یہ آواز اپنے دور کی سب سے منفرد اور موثر آواز ہے۔ میں نے عطاء کا عروج لمحہ بہ لمحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور عام لوگوں کے برعکس مجھے اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ حیرت ایسا نہ ہونے پر ہوتی۔ فن کی خاطر مصائب تو ہر فنکار برداشت کرتا ہے مگر حوصلہ شکنی اور بے قدری کے جن تلخ تجربوں سے عطاء گزرا ہے ان کا تصور ہی لرزہ خیز ہے۔ عیسیٰ خیل جیسی سنسان جگہ پر جسے تہذیبی اعتبار سے ایک دور افتادہ جزیرہ کہنا مناسب ہو گا۔ محض اپنے ذوق کو زندہ رکھنا ہی کچھ کم کمال نہیں۔ تو بیت اور رہنمائی تو دور کی بات ہے اس کی محنت کو وقت کا ضیاع اور اس کے شوق کو تسائل پسندی قرار دیا گیا مگر عطاء اپنی منزل متعین کر چکا تھا اور سفر کے لئے زادِ راہ.....شوق، صلاحیت، محنت کی عادت اور راستے کی رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لانے کی ہمت سے قدرت نے اُسے اِس حد تک نوازا تھا کہ وہ کسی کی حوصلہ افزائی کا محتاج، سرپرستی کا دستِ نگر اور راہنمائی کا حاجت مند نہ تھا وہ اللہ کے بھروسے اور اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ اندازہ کیجئے کہ عطاء نے تقریباً ۱۲ سال تک ایک تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر اپنے فن کی تہذیب و تربیت کی۔ عیسیٰ خیل دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر دریا سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر واقع ہے مگر دریا کی ایک شاخ جسے مقامی زبان میں واہی کہتے ہیں۔ شہر کے جنوبی کنارے سے لگ کر گزرتی ہے۔ واہی کی چوڑائی تقریباً ۱۰۰ میٹر اور گہرائی پانچ سات فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ موسم گرما کی چاندنی راتوں میں بعض اوقات موسیقی کی محفل واہی کی

شفاف پُرسکون سطح پر ایک کشتی میں برپا ہوتی۔ عطاء کی پُرسوز آواز فضا میں بلند ہوتی تو سندھ کے پانی کی سطح پر چاند کا والہانہ رقص ایک عجیب سا سماں باندھ دیتا۔ حیرت سے دم بخود ستارے آنکھیں جھپکنا بھول جاتے اور سطح آب سے چھو کر گزرتی ہوا کے قدم بے اختیار رک جاتے۔ چاندنی راتوں کی ان روح پرور محفلوں کا سرور اُن محفلوں کے حاضرین کو آج بھی رگ رگ میں محسوس ہوتا ہے۔ چاند کی پاکیزہ کرنوں، سنھ کے معطر پانی اور سطح آب پر تھرکتی ہوا سے براہ راست اکتساب فیض ہر فنکار کے نصیب میں کہاں؟ عطاء کو دوسرے فنکاروں سے ممتاز کرنے میں اور باتوں کے علاوہ فطرت سے اس براہ راست تعلق کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ اس زمانے میں سرائیکی اور پنجابی کے شعراء کی اس قدر بھرمار نہ تھی جو آج ہے۔ اس لیے عطاء زیادہ تر پُرانے مقامی شعراء کا کلام گاتا تھا۔ عطاء کے والد محترم کی قلندرانہ خودداری ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی خودداری کو سلامت رکھنے کے لئے انہوں نے خاندانی جاگیر سے دست بردار ہو کر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروسز کے شعبہ مالیات میں ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا۔ ملازمت کا زیادہ عرصہ گوجرانوالہ اور کچھ عرصہ فیصل آباد میں بسر ہوا، ملازمت کی مدت پوری ہوئی تو عیسیٰ خیل واپس آ گئے۔ پنشن وغیرہ کی صورت میں جو رقم ملی اس سے کپڑے کی تجارت شروع کی۔ دیہات میں کپڑے کا کاروبار زیادہ تر اُدھار پر چلتا ہے۔ مفلس و نادار گاہک تن ڈھانپنے کو حسبِ ضرورت کپڑا ادھار تو لے جاتے ہیں مگر اس کی قیمت کی وصولی ایک ایسا طویل اور تکلیف دہ عمل بن جاتی ہے۔ باضمیر انسان اس کاروبار سے جلد بیزار ہو جاتا ہے۔ عطاء کے والد اس کاروبار سے عاجز آ گئے تو ایک ڈیزل انجن خرید کر لکڑی چیرنے کا آرا لگوا لیا۔ یہ کاروبار راس نہ آیا تو آٹا پیسنے کی چکی لگوا لی۔ سرمایہ اتنا کم تھا کہ ملازم رکھنے کی استطاعت نہ تھی۔ اپنی صحت اتنی کمزور تھی کہ خود کام کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس بے بسی کے عالم میں باہمت جوان بیٹا باپ کا سہارا بن گیا۔ تنگدستی کا یہ دور عطاء کے لئے ایک ہمت شکن آزمائش کا دور تھا۔ اللہ کی عنایت نے آزمائش کے اس دور میں بھی اس کے اندر کے فنکار کو زندہ اور اس کے عزم کو جوان رکھا۔ والد کے کاروبار کی کچھ حالت بہتر ہوئی تو عطاء نے عیسیٰ خیل کے مین بازار میں ''الصدف'' کے نام سے ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور بنا لیا۔ ۶۹۔۱۹۶۸ء میں جب پاکستان پیپلز پارٹی میدانِ عمل آئی تو پارٹی کے خوش آئند منشور نے متوسط طبقے کے نوجوانوں کو فی الفور متوجہ کیا اور روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے چار سو گونجنے لگے۔ ضلع میانوالی میں پیپلز پارٹی کو حبیب اللہ خان وھلہ عظمت خان والا نے متعارف کروایا۔ سب سے پہلے عطاء نے عیسیٰ خیل میں جئے بھٹو کا نعرہ بلند کیا۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی اس زمانے میں عطاء شاہین کہلاتا تھا۔ پارٹی کے لئے اُس کی خدمات کے صلے میں اسے پارٹی کی صوبائی قیادت کی طرف سے ایک عدد سہراب سائیکل عطا ہوئی جو ایک عرصہ تک اس کی ہم سفر رہی۔ سہراب سائیکل سے مزدا ۹۲۹ تک کا سفر عطاء نے پیدل طے کیا۔ مگر کچھ اس تیزی سے کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ جب صرف ایک کیسٹ ریکارڈ کرنے کے لئے کراچی کے ایک صاحب نے چمکتی دمکتی نئی ہنڈا ۱۱ کار ڈکار عطاء کی نذر کر دی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ شخص اللہ کی عطاء ہے اُن لاکھوں دلوں کے لئے جن کی لڑکھڑاتی دھڑکنیں اس کی آواز سُن کر سنبھل جاتی ہیں۔ یہ شخص قدرت کی ایک نعمت ہے ان کروڑوں غم زدہ مجبور انسانوں کے لئے جن کی زندگی کی ساری محرومیاں اور تلخیاں اس نے اپنی آواز میں یوں سمیٹ لی ہیں جیسے زہر مہرہ کسی انسان کے جسم سے سانپ کا سارا زہر چوس کر اسے اذیت ناک موت سے بچا لیتا ہے۔

اس کی گھمبیر پُرسوز آواز کبھی کسی معصوم بچے کی سسکی، کبھی کسی غم نصیب بیوہ کی ہچکی، کبھی کسی مجبور و بے بس ہجر کی ماری دوشیزہ کی دل وز چیخ اور کبھی کسی بخت جلی ماں کا بین بن کر دلوں کے آر پار ہو جاتی ہے۔ عطاء کی آواز وہ آواز ہے جس کے اثر کو گاما پا دھانی کے پیمانے سے نہیں ماپا جا سکتا۔ اس کی مقبولیت بلاوجہ نہیں۔ یہ آواز وہ اکلوتی آواز ہے جو ہر غمزدہ دل میں تیر کی طرح اترتی ہے اور خون میں سرایت کر کے پورے وجود میں تیرتی ہوئی انسان کے اندرونی زخموں کو کچھ اس طرح کُریدتی ہے کہ تمام کرب اور اذیت، دکھ اور درد یا تو اشکوں میں ڈھل کر آنکھوں کے راستے زائل ہو جاتا ہے یا پھر ایک کیف اور غبار بن کر درد سے چٹختے اعصاب کو سکون کی نیند سُلا دیتی ہے۔ اونچے سُروں کی شاخوں میں اُلجھ کر جب یہ آواز کسی زخمی پرندے ہی کی طرح پھڑ پھڑاتی ہے تو روح کا شجر جڑوں تک لرز اُٹھتا ہے اور پھر جب اس بلندی سے کسی زخمی پرندے ہی کی طرح یہ آواز ایک ہچکی کے ساتھ نیچے کو آتی ہے تو ہارمونیم پر عطاء کی انگلیوں کی لرزش رقص بسمل کا منظر بن جاتی ہے۔ عطاء کی آواز کے بارے میں ایک حیران کن بات ریڈیو پاکستان ملتان کے سارنگی نواز محمد نے بتائی۔ چند سال قبل وہ عطاء کے ہمراہ ایک محفل موسیقی کے سلسلے میں عیسیٰ خیل آئے۔ بر سبیل تذکرہ انہوں نے بتایا کہ سارنگی کا سب سے اہم تار چمڑے کا تانت ہوتا ہے مگر عطاء کی آواز میں نہ جانے کیا بات ہے کہ چمڑے کا تانت اُن کی آواز کا ساتھ نہیں دیتا۔ ایک آدھ مرتبہ اُن کے ساتھ سنگت کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ چمڑے کے تانت سے وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ لہٰذا ان کے ساتھ سنگت کے لئے میں سٹیل کا تار استعمال کرتا ہوں اور سٹیل کے تار سے انگلیوں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لئے اُنپر پلاسٹر ٹیپ لپیٹ لیتا ہوں۔ عطاء نے مسلسل محنت سے ایک ایسا لہجہ اپنا لیا ہے جس میں شیرینی اور اداسی کا ایک حسین امتزاج سننے والوں کو اپنی روح میں گھلتا محسوس ہوتا ہے۔ عطاء کو گلوکار کی حیثیت سے جاننے والے بہت کم لوگ یہ جانتے ہوں گے۔ عطاء نہ صرف شعروں کے انتخاب کی حد تک بلند پایہ ادبی ذوق کا مالک ہے بلکہ ایک بہت اچھا قلمکار بھی ہے۔ وہ دل میں اُتر جانے والے گیتوں کے علاوہ نثر بھی بہت خوبصورت لکھتا ہے۔ اُس سے خط و کتابت کرنیوالے لوگ یقیناً اس کی تحریر کی خوبیوں کے معترف ہوں گے اور صرف یہی نہیں اس کی خوشنویسی بھی اپنی مثال آپ ہے۔ محفل کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ عطاء پوری محفل کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور کوئی بھی فرد خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ نغمہ سرائی کے دوران محفل کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور کوئی بھی فرد خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ نغمہ سرائی کے دوران محفل کو ہمہ تن متوجہ رکھنے کیلئے عطاء اشعار کے علاوہ بعض اوقات ایک آدھ خوبصورت جملہ نشانے پر پھینک کر توجہ حاصل کر لیتا ہے اور یوں اپنی بے نظیر گلوکاری کے علاوہ اپنی حاضر جوابی اور برجستہ گوئی کی داد بھی سامعین پر قرض نہیں رہنے دیتا۔ یہ وہ آواز ہے جس نے موسیقی کا ذوق ہی بدل کے رکھ دیا۔ لوگ گلوکاری کو اس آواز کی بدولت وہ مقبولیت ہوئی کہ مرحومہ نازیہ حسن جیسی سراپا پاپ سنگر بھی ''ٹاہلی دے تھلے بہہ کے'' گانے پر مجبور ہو گئی۔ اور کلاسیکی موسیقی کے شہنشاہ امانت علی خان کا شہزادہ ''عمراں لنکھیاں پَباں بھار'' الاپتا نظر آیا۔ عطاء کو جتنا میں نے قریب سے دیکھا ہے اُس کی بنا پر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عطاء تاش کے ماہر کھلاڑی کی طرح اپنے پتے وقت سے پہلے نہیں دکھاتا اور یہی اس کی جیت کا راز ہے۔ لالہ جیسے جہاں گرد فنکار کا ہر جگہ ساتھ تو اُس کے بیوی بچے بھی نہیں دے سکتے۔ یہ ماہیا شاید کسی نے ''لالہ'' کے بارے میں ہی کہا تھا۔ ''دِلا ہُن بس چا کر ڈھولا کتھے کتھے نال ہووے'' پرندوں کی طرح اس کا رزق بھی پورے کرہ ارض پر بکھرا ہوا ہے بلاشبہ وہ دنیا بھر میں پاکستان کی پہنچان اور ہمارے

کلچر کا تعارف ہے۔ اس حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکیلے عطاء نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جو ہمارے سفارت خانے کروڑوں روپے خرچ کر کے بھی نہ دکھا سکے۔ عطاء ہماری قوم کا مان ہے۔

اشک آلود خاک

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

میری آواز اچھی نہیں رہی پھر بھی گانے سے باز نہیں آتا۔ دراصل گانا، گنگنانا فطرت کا ایک سچا سوہنا عمل کثیر ہے۔ پرندے اور ہوائیں گرمیوں کی دوپہروں، سرگی و یلے کی برکتوں اور تنہائی کی کشادگیوں میں گاتے ہیں تو ہمیں زندگی کے ہونے اور خود اپنے بہت ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ آوازیں جہاں کی بھی ہوں دلوں کے در کھول لیتی ہیں۔ میٹھے بول اور نرم آوازیں قدرت کی بڑی نعمتیں ہیں اور تحقیق ''تم اللہ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''۔ اس میں آدمی کے اختیار اور ہستی کو کوئی دخل نہیں۔ اچھی شکل اور اچھی آواز خالق حقیقی کے راز آواز اور لفظ لگتا ہے مل کر کوئی مستی تیار کرتے ہیں۔ میں اپنے ہاں کے بہت مقبول بہت بڑے گلوکر عطاء اللہ خان نیازی سے کئی دفعہ مل چکا ہوں اور اسے کئی ہزار بار سن چکا ہوں اب تو اس کی سننا نہ سننا اپنے بس میں نہیں۔ اپنے شہر میانوالی اپنے ملک پاکستان میں آپ کہیں چلے جایئے اور وہاں چلے جایئے جہاں پاکستانی پاکستانیوں سے محبت کرنے والے رہتے ہوں۔ عطاء اللہ کی آواز بھی آپ کی ہمسفر ہوگی پاکستان کے باہر بھی آپ کا تعاقب کرے گی۔ بازاروں، بڑے ہوٹلوں، چھوٹے چھوٹے ٹی سٹالوں، عالی شان بنگلوں، کچے گھروندوں دوستوں یاروں کی ہر طرح کی محفلوں میں اس کے کیسٹ بج رہے ہیں بلکہ یوں کہیے وہ اپنے کیسٹ بجا رہا ہے۔ اس کے ساتھ شامیں منائی جاتی ہیں جو بھیگتی راتوں میں داخل ہو کر صبحوں تک جا پہنچتی ہیں۔ جب کسی کھلی جگہ پر اس کی آواز کا سوز سُر میں ڈوبتا ہے تو بڑے بڑے عوامی لیڈروں کے جلسہ عام سے کہیں زیادہ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ انتظامات کے سارے زور ٹوٹ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب سے عطاء اللہ کے کیسٹ مارکیٹ میں آنا شروع ہوئے۔ کاروباریوں نے اور کام چھوڑ کر ٹیپ ریکارڈروں اور کیسٹوں کے کاروبار پر ہی اکتفا کر لیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عطاء اللہ کا سننا اب فیشن بن گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سننے کا جنون چل پڑا ہے۔ جیسے کوئی اچھی وباء عام ہوگئی ہو۔ ایک دوست کی روایت ہے کہ میانوالی سے کراچی تک کے سفر میں جب ہم سندھ کی ایک سنسان جگہ پر اکلوتے کھوکھا نما سٹاپ پر رات کے دو ٹکڑوں کے درمیان ٹھہرے، جہاں قرب و جوار کے کھیت بھی نہ تھے تو ہمیں چائے کی چسکیوں کے ساتھ دل رنگ سسکیوں جیسی اس آواز نے عجب اداس شادمانی کے احساس سے مالا مال کر دیا۔ میانوالی والوں کے لئے کیا یہ فخر کم ہے کہ ہماری ہی ایک آواز نے جذبوں کا ایک وسیع و عریض علاقہ آن کی آن میں فتح کر لیا ہے۔ یہ تسخیریں ہوا کی زنجیریں بن کر پھیلتی ہی چلی جا رہی ہیں۔ مجھے یہاں کی ایک اور آواز ناہید نیازی سے بھی لگاؤ ہے۔ قبائلی روایت میں لوگ عورت کی اس ادا کو روگ جانتے ہیں مگر آواز کی پرواز اپنے اندر کی بلندیوں میں کون روک سکتا ہے۔ مجھے ہمیشہ ناہید کی صدا کسی تھکی ہوئی ہرنی کی دھیمی دھیمی چیخوں

کی طرح سنائی دیتی ہے۔ وہ گاتی ہے دل ٹھاٹھاں پیا مریندے۔ اور دل واقعی ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔ وہ ایک بلند مرتبہ گلوکارہ ہے مگر یہاں کے لوگوں میں کوئی مقام نہیں بنا سکی۔ نجانے وہ عطاء اللہ کو سنتی ہوگی تو کیا محسوس کرتی ہوگی۔ چھریرے بدن کے اس کے اس نوجوان نے اپنی زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ ایک دن اپنی آواز کی انگلی پکڑ کر یہاں تک پہنچ جائے گا۔ لوگ کہتے ہیں عطاء اللہ اتفاقاً اتنا خوش قسمت ہو گیا ہے۔ میں زندگی میں اتفاقات کا قائل ہوں مگر اس کے پس منظر میں محبت اور محنت کے بڑے بڑے دریا بہہ رہے ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عطاء اللہ نے ابھی اپنے آپ کو اور ظاہر کرنا ہے۔ اگرچہ ایک زمانہ اس کے دائرہ مقبولیت میں رہنے لگ ہے۔ وہ بچپن سے گا رہا ہے مگر گھر میں اسے کون سنتا ایسے میں اکیلگیاں اور ہوائیں آوازوں کی میزبان ہوتی ہیں۔ ویسے تب اس نے عیسیٰ خیل میں بھی ایک جگہ بنائی تھی۔ ریاض کی جگہ، وہاں خلوتیں بھی تھیں اور دوست یار بھی دوسرے لوگ بھی۔ وہاں کسی کو بھی گانے سے نہ روکا جاتا۔ یوں دیہاتوں میں کھلی فضاؤں اور بند غسل خانوں میں ہر کوئی گا لیتا ہے۔ عطاء اللہ نے بھی اسی طرح آغاز کیا۔ پھر جب اس نے آواز کے ساتھ ساز بھی ملا لیئے تو گھر والے بپھر گئے۔ گھر کی مرغی دال برابر، اب اس کے لئے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ککڑاں دھمی دیا ادھراتی ڈتی ہئی بانگ..... کیونکہ اُس کی آواز کی تپش میں راتیں سلگ اٹھتی ہیں۔ اور صبحیں لہولہان ہو رہی ہیں۔ سچی بات ہے کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ یہ میراثیوں کا کام نہیں ہے۔ لہو رنگ نسلوں میں بھی یہ امنگ جاگ پڑتی ہے۔ گانا یا کوئی فن آدمی کو دردمند کرتا ہے بہادر بناتا ہے۔ اس طرح دیوانگی بھی پیدا ہوتی ہے اور مردانگی بھی۔ میرا خیال ہے یہ چیزیں لازم وملزوم ہیں۔ اظہار آدمی کے اندر اختیار کو بڑھاتا ہے۔ معاشرے میں بہت سے کومل اور مضبوط جذبے تخلیق ہوتے ہیں۔ جہاں لوگوں میں گانے کا شغل عام ہو زندگی سندر کیفیتوں سے بھر جاتی ہے۔ عطاء اللہ سے گانے سن کر لوگوں کا دل بھر آتا ہے۔ اس سے یہ بہانہ ہاتھ آتا ہے کہ شاعری اور موسیقی مردِ میداں بننے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ میں کہتا ہوں جو صاحب درد نہیں وہ صاحب میدان کیسے ہو سکتا ہے۔ طاؤس اور رباب آخر کی بات بھی درست ہے۔ مگر خاک جب تک اشک آلود نہیں ہوتی، خون آلود کیسے ہو سکتی ہے۔ عطاء اللہ کی مقبولیت ہماری ثقافت اور معاشرت اور اپنی زبان کو اپنے گانے کا عنوان بنانے کی وجہ سے ہے۔ اس طرح اس نے یہاں کے لوگوں کے جذبے دُکھ سُکھ اُن کو یاد دلا دیئے ہیں۔ آخر لوگ اسے سننے کے لئے کیوں پاگل ہوئے جا رہے ہیں۔ اس نے انہیں اُن کی محبتوں کی امانتیں واپس دلانے کی کوشش کی ہے جو وہ بھولتے جا رہے تھے۔ وہ اسے سنتے ہیں تو شاید انہیں کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ جیسے وہ بھولتے جا رہے تھے۔ وہ اسے سنتے ہیں تو شاید انہیں کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ جیسے وہ اچانک جاگ پڑتے ہیں۔ لوگوں کی محسوس ہوا کہ جو کچھ ان سے چھین لیا گیا ہے اور جو کچھ ان کے پاس بچ رہا ہے وہ واقعی اُن کا اپنا ہے۔ وہ قیمتی ہے، اہم اور زندہ۔ ان کی زندگی کرنے کی تہذیب انکا اثاثہ ہے۔ عطاء اللہ سے لوگوں کی محبت کی بات کی ہے۔ اس نے جدائیوں کی بات کی ہے۔ دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی وچھوڑے میں مبتلا ہے۔ کسی نہ کسی کا منتظر ہے۔ اسے کسی کے ملنے کی آس بھی ہے ایک ناامیدی سی بھی ہے جو امید کی بہت حد تک ہمشکل ہے۔ اسے ہجوم میں سُن کر لوگ بڑھکیں مارتے ہیں اور تنہائی میں سن کر آہیں بھرتے ہیں۔ لڑکیوں کو چیخیں مار کر روتے ہوئے بھی سنا گیا ہے ہے۔ وہ جو کچھ گاتا ہے جس طرح گاتا ہے۔ سیدھا دل پر جا کے لگتا ہے۔ ٹھاہ کر کے بھی لتا ہے اور یوں بھی جیسے پیاسی مٹی پر بارش کی بوند پڑتی ہے۔ اس نے کسی سے تربیت نہیں لی۔

کسی کی نقل اتارنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایک علیحدہ ایل الگ احساس دینے والی آواز کے ساتھ گاتا ہے۔ کچھ اہلِ فن کہتے ہیں کہ عطاء اللہ موسیقی کے کسی قاعدے کلیے کو تسلیم نہیں کرتا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لوگوں نے عطاء اللہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ کیا محبت کرنے کا بھی کوئی قاعدہ ہے۔ کسی کے لئے تڑپنے کے لئے کسی ٹریننگ کی ضرورت نہیں۔ عطاء اللہ محبت میں تڑپنے والوں کا گلوکار ہے۔ عجب حال عطاء اللہ کے گانے سن کر ہوتا ہے۔ بس کچھ ہو جاتا ہے جو بہت سے گانے والوں کو سن کر نہیں ہوتا۔ اردو میری قومی زبان ہے۔ پاکستانی ہونے کی حیثیت سے یہ میری شناخت ہے مگر کچھ آوازیں کچھ خاص زبانوں کے لئے ہوتی ہیں۔ کوئل کی کوک، چڑیوں کی چہکار تو نہیں بن سکتی۔ ایک دلاویز خالص آواز ریشماں صحرائی کونج ریگستانوں سے تلاش کر کے لائی گئی۔ وہ جب اپنے لفظوں میں گاتی ہے تو ایک بے نیا نشہ فضا میں سرایت کر جاتا ہے۔ جب اُسے اردو سکھانے اور اپنے انداز سے گانا پڑھانے کی کوشش کی گئی تو اس کی آواز کے ریشم میں پیوند لگنے لگے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آدمی صرف ایک زبان میں گا سکتا ہے۔ کچھ صدائیں کئی زبانوں کے قالب میں سما جاتی ہیں۔ ہر قوم کے لفظ ان کا انتظار کرتے ہیں۔ ہاں عطاء اللہ کے لئے ایک بات خاص ہے کہ وہ گاتے ہوئے زبانوں کو رلا ملا دیتا ہے۔ اردو میں سرائیکی، سرائیکی میں میانوالوی۔ اس انداز میں وہ بہت کامیاب رہا ہے۔ وہ ایک لوک فنکار ہے۔ اسے تو شاید اکثر اوقات یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کس شاعر کا کلام گا رہا ہے۔ وہ گائیکی پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ کسی شاعر کو، اس کی وجہ سے پہنچان نہیں مل سکی۔ وہ تو آواز کا ایک جادو ہے جو سر چڑھ کر نہیں دلوں میں گھُل مل کر بول رہا ہے۔ اس نے اردو میں بھی محسوس ہونے والے کا کامیاب انداز سے گایا ہے۔ غلام علی عطاء اللہ کو اچھا لگتا ہے۔ وہ اردو اور پنجابی میں یکساں اور مشترک دلربائی سے گاتا ہے۔ جس طرح عطاء اللہ سرائیکی اور اردو میں۔ اب میں آپ کو ایک ماہیا سناتا ہوں جسے عطاء اللہ کی آواز میں سنیں گے تو آپ کو اور کچھ یاد آ جائے گا۔

گڈی کوک مریندی اے وچھڑیاں ہوئیاں نوں پئی یاد کریندی اے

ہمارے علاقے یعنی محبتوں اور محبوب کی جدائیوں والے علاقے سے گزرتی ہے تو گاڑی بھی سُر میں کوک مارتی ہے یا پھر جن دلوں میں ہوک اٹھ رہی ہوتی ہے ان کو ایسا ہی سنائی دیتا ہے۔ آج کل دل والوں کے علاقوں میں عطاء اللہ کی آواز کا آنا جانا ہو رہا ہے۔ ان دنوں شامیں اُجڑی ہوئی ہیں اور زندگی گرے ہوئے مکانوں جیسا نقشہ پیش کر رہی ہے۔ ہماری صبحیں بھی غفلت سے بھر گئی ہیں۔ صبح سویرے پرندوں کی کئی صداؤں سے بھرے ہوئے گیت روحوں سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ ہم نے گھنی دوپہروں سے بھی یاری ختم کر لی ہے۔ ہم ویران ہو گئے ہیں اور عطاء اللہ کی آواز ہمیں اور ویران کر دیتی ہے۔ آخر میں پہلی بات کہ عطاء اللہ نیازی جب عیسیٰ خیل میں تھا تو چھپ چھپ کر لگیاں تھانواں پر جا کر پرندوں کو اپنے گاؤن سناتا تھا۔ پتھروں اور پرندوں نے اس دعا دی۔ اب اسنے پتھر دل لوگوں کو گاؤن سنانا شروع کر دیئے ہیں اور اسے سن کر اپنے اندر زخمی پرندوں جیسی پھڑ پھڑاہٹ محسوس کرتے ہیں۔

عطاء کی پُجارن..... پاربتی دیوی

نوید احمد خان وللہ والا

گنیش دیوتا اپنی لمبی سونڈ کی وجہ سے پریشان رہتے تھے کیونکہ وہ صحیح بول نہیں پاتے تھے۔آکاش پہ بیٹھے مُہان دیوتا بھی خاموش تھے۔ پاربتی دیوی نے گنیش دیوتا کو اپنا بھائی بنایا ہوا تھا۔ اس ناطے ایک دن اس سیتا ساوتری دیوی نے پرت رکھ کر شیو جی کا چالیس دن کا جاپ کیا۔ جاپ کے دوران کلنکی آتماؤں اور گندے بیروں نے اس پوتر دیوی کے سُندر شریر، بدھی اور ھردے کو ہر طرح سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن گرو پرشاد کی آگیا سے اس دیوی کی تپسیا نشٹ نہیں ہوئی بلکہ مہان دیوتاؤں نے دیوی کو تنگ کرنے والی کلنکی آتماؤں اور گندے بیروں کو سیراپ کیا اور پاربتی دیوی کو یہ ادھیکار دیا کہ وہ اپنی شکتی سے اپنی پریکتا اور تپسیا جاری رکھے۔ پوتر ماحول... دیوی کی سُندرتا جو اس نے گنیش دیوتا کی آواز کے لئے تیاگ دی اور یہ وچار کیا.....سوگند کھائی کہ ترنت ہی میں آکاش کے دیوتاؤں سے یہ پرایت کرلوں گی کہ اپنے بھائی کو بولتا دیکھ لوں۔ پاربتی دیوی اپنے وچار میں سپھل ہوگئی۔ اس سیتا ساوتری دیوی کی تپسیا اور پریکشا آکاش کے مہان دیوتاؤں نے سویکار کیا۔ کیونکہ وہ سمے اور استحان قبولیت کا تھا۔ پاربتی دیوی کی پراتھنا سعئیکار کی گئی اور یوں وہ جن کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ ایسے بولے کہ چرند، پرند تک ان کی آواز کو سن کر جھوم جاتے اور جیسے بھگوان کے ترانے الاپتے، چلتی پون بھی رک جاتی۔ یہ بھگوان کی دیا تھی کہ اس نے ایک پوتر سیتا ساوتری کی ایک دیوتا کے لئے پراتھنا قبول کی۔ گنیش دیوتا بھگوان کے بھجن گاتے اور پاربتی دیوی اس آواز کی سندرتا میں کھو جاتی۔ سمے رک جاتا۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ موجودہ دور میں دیکھیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ بھگوان کی دیا ہے کہ کسی دیوی کی بے رخی سے ہم جیسے سیوا کوں کو عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی درد بھری آواز سننے کو ملی اور یہ مُہان گلوکار ہمارے دور میں موجود ہے۔ اس دیوی کی سوگند جس نے استری کو عزت دی۔ جس کی وجہ سے عطاء کی آواز میں درد کی لہر سمائی۔ اگر یہ کومل.....سندر آواز پاربتی دیوی سن لیتی تو بھگوان کرشنا کی پریکشا چھوڑ کر، گنیش دیوتا کی آواز کا سحر توڑ کر اور رنگوں بھری سورگ سے منہ موڑ کر عطاء کی پُجارن بن جاتی لیکن اس پر بھی کیا بعید کہ وہ اب بھی.....یہیں کہیں.....کسی سندری ناری کے روپ میں عطاء کی پُجارن ہو اور اس کی نیر بھری آواز کی داسی ہو۔ اس کے شریر ہردے، بدھی، آنما میں عطاء ہی عطا بسا ہوا ہو اور وہ ہر سمے عطاء، عطا عطا کا جاپ کرتی ہو۔

عطاء اللہ کی ہُوک

ڈاکٹر حسن رضوی

سفید چمکتے ریتلے علاقے کے دن انتہائی گرم اور راتیں خوشگوار اور ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ ان علاقوں کے موسموں کی دھوپ چھاؤں کا اثر وہاں کے رہنے والوں کے مزاج میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ گنگناتی فضاؤں اور ریت کے ٹیلوں کا علاقہ جہاں تھل پر اونٹوں کے پاؤں کی تھاپ کی گھنٹیاں سنائی دیتی ہیں اور سریلے لہجے میں دلوں کی کُوکیں بھی تھل کے رہنے والوں کے مزاج میں جہاں کڑی دھوپ کی تمازت

دکھائی دیتی ہے وہاں اُن کی طبیعتوں میں ٹھنڈے صاف شفاف پانیوں کی گنگناہٹ بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ میانوالی ہو یا عیسیٰ خیل موسیٰ خیل ہو یا کالا باغ، کندیاں ہو یا ماڑی انڈس، یہاں کے باسیوں نے جہاں اپنی وجاہت اور جرات کے تاریخی باب رقم کئے ہیں وہاں کھیل، ادب، ثقافت کے میدان میں بھی اس علاقے کے تشخص کو ابھارا ہے۔ یہ علاقہ جہاں ملک امیر محمد خان مرحوم نواب کالا باغ کے رعب اور ادب کے میدان میں مایہ ناز استاد اور ادیب تلوک چند محروم جیسے انسان دوست کی پُر خلوص مہکاروں کا مسکن بھی ہے۔ اس علاقے کے سپوتوں نے جہاں حمید اللہ خان سنبل شہید کی طرح اپنے لہو سے داستان حُب الوطنی لکھی ہے وہاں ہاکی اور کرکٹ کے میدان میں طارق نیازی و رعمران خان جیسے مایہ ناز کھلاڑی نے دنیا بھر میں ملک وقوم کا نام روشن کیا ہے یہ وہ علاقہ ہے جہاں کی مٹی کی خوشبو جگن ناتھ آزاد، رام لعل، ہرچرن چاولہ اور مولانہ کوثر نیازی سے لے کر نئی نسل کے نمائندہ ادیب اور شاعر اجمل نیازی کی تحریروں میں مہکار اور حیرتوں کے کئی نئے در وا کرتی ہے۔ اسی حیرت کدے میں حیران کرنے والی بات دلوں کی گہرائیوں میں اترنے والی آواز عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کی ہے۔ یہ وہ درد بھری آواز ہے جسے سن کر دل کی کونجیں تڑپ تڑپ اٹھتی ہیں۔ اس آواز میں تپتے ہوئے صحراؤں کی کُوک بھی ہے اور ٹھنڈے بہتے پانیوں کی گنگناہٹ بھی۔ یہ آواز عطاء اللہ کے دل سے ہوک بن کر اٹھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سننے والوں کی کوک بن جاتی ہے۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی ایک کسان کا بیٹا ہے۔ جس نے آنکھ کھولتے ہی فطرت کے سرسبز شاداب مناظر کو اپنی آنکھوں میں لہراتے دیکھا جس کے کانوں میں پرندوں کی چہچہاٹوں نے رس گھولا۔ جس نے ہواؤں کی سرسراہٹوں میں درختوں کے پتوں سے تالیوں اور ڈھولک کی تھاپ کی آواز سنی۔ جس نے غربت اور افلاس کی تحریریں پڑھیں۔ اور لوگوں کے دلوں میں جھانک کر آہوں کے سرد خانے دیکھے۔ جس نے لہلہاتی فصلوں کے ساتھ ساتھ لہراتے ہوئے بازوؤں میں چوڑیوں کی چھنکاروں سنیں۔ جس نے تپتی ہوئی دوپہروں میں کیکروں کی چھاؤں تلے ادنیاں بھریں اور جو ٹھنڈی راتوں کی تنہائی میں چاند اور چاندنی سے ہم کلامی کرتا رہا۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز میں آج زندگی کے تمام رویئے اس کی منفرد پہچان ہیں۔ اس نے موسیقی کی تعلیم کسی استاد سے نہیں بلکہ فطرت سے حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ راگ اور راگنیوں کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرتے ہوئے بھی اس کی گائیکی کے راگ محبت کی میٹھی آگ ہیں۔ جس کی آنچ کو ہر کوئی محسوس نہیں کرسکتا ہے لیکن دل کا درد جاننے والوں کے لئے یہی آگ ان کے دلوں کا راگ ہے۔ آخر میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ہمارے یہاں باقی لوگ گلے سے گاتے ہیں اور وطاء اللہ عیسیٰ خیلوی دل سے گاتا ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

گائیکی کا تربیلا ڈیم

ڈاکٹر طاہر تونسوی

میں نہ تو علم موسیقی سے واقف ہوں اور نہ ہی سات سُروں کی دنیا کو پہچانتا ہوں۔ البتہ موسیقی کو چونکہ روح کی غذا کہا جاتا ہے۔ اس لئے روحانی غذا حاصل کرتا ہوں اور ویسے بھی شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے موسیقی سے لطف اندوز بھی ہوتا

ہوں اور موسیقی سے شاعری میں بھی کام لیتا ہوں۔ ایک خاص بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ایسی موسیقی کو پسند کرتا ہوں جس میں کلاسیکی موسیقی کی آمیزش ہو۔ پاپ موسیقی مجھے قطعی طور پر ناپسند ہے۔ البتہ میں اس کے حوالے سے رقص کو پسند کرتا ہوں کہ رقص بقول جوش ملیح آبادی اعضاء کی شاعری ہے۔ اور میں ٹھہرا شاعر اور شاعری کا پرستار.....سُو موسیقی اور شاعری میری زندگی کے سبھی لمحات کے ساتھی ہیں۔ کہتے ہیں کہ حسن سوگوار میں جو کشش ہوتی ہے اس کا کیا کہنا۔ اسی طرح شاعری اور موسیقی میں المیاتی تصویریں اور تانیں دل میں کھب جاتی ہیں۔ خاص طور پر وہ موسیقار جو درد کی لے الاپ کر سوز و گداز کے نغمے گا رہا ہو۔ وہ دلوں کے تاروں کو ہلا کے رکھ دیتا ہے۔ ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی صدا، غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے ساز اور درد و کرب سے بھرپور آواز ہمیشہ مجھ پر جادو کر دیتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ میرے وہ دکھ ہیں۔ جنہیں میں اپنے سینے سے لگائے پھرتا ہوں اور ان کا اظہار لفظوں کے حوالے سے بھی نہیں کرتا۔ اس لیے میرے غم تو میرے ہی ہیں اور میں دکھ دینے والے کو بھی دعائیں دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنے یہ دکھ عزیز ہیں۔ بالکل دکھ دینے والے کی طرح.....اور یہی دُکھ زندگی کی بقاء کے ضامن ہیں۔ ورنہ وہی غالب والی بات۔

کہ خوشی سے مَر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اس تناظر میں وہ فنکار جو لحن داؤدی بھی رکھتا ہو مگر اس کے گلے میں سُوز و گداز بھی ہو۔ میرے لیے منفرد بھی ہے اور معتبر بھی.....

اور پھر سرائیکی کی مٹھاس شیرینی اور سوز و غم دریا کی جوشیلی لہروں کی طرح اُبھر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زاہدہ پروین، ثریا ملتانیکر، پٹھانے خان مجھے بے حد پسند ہیں اور اب عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی میرے دل کی دھڑکن بن گیا ہے۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی پچھلی کئی دہائیوں سے گائیکی کے فن کے حوالہ سے منظر نامے پر اُبھرا ہے اور اپنے ہمعصر گلوکاروں کو بہت پیچھے چھوڑ گیا ہے اور اس معاملے میں وہ بڑا ہی خوش قسمت گلوکار ہے کہ اس نے بہت جلد شہرت کی آسمانی بلندیوں کو چھو لیا ہے ورنہ فنکار کا تو المیہ ہی یہی ہے کہ وہ ساری عمر فن کی خدمت کرتا رہتا ہے اور اس میں اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے مگر پھر بھی اس کی قدر نہیں ہوتی مجید امجد نے اپنی معروف نظم ''آٹو گراف'' میں فن کار کے اسی المیے کا ذکر کرتے ہوئے بڑے کرب انگیز انداز میں کرکٹ کے کھلاڑی اور فنکار کا موازنہ کیا ہے۔ نظم کا آخری ٹکڑا کچھ یوں ہے۔ میں اجنبی میں بے نشاں.....میں پابہ گل نہ رفعت مقام ہے نہ شہرت دوام ہے.....یہ لوحِ دل یہ لوحِ دل.....نہ اس پہ کوئی نقش ہے نہ اس پہ کوئی نام ہے مگر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی کیفیت اس سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ وہ اپنی زندگی میں جن صدیوں، کرب ناکیوں، کلفتوں، صعوبتوں، تکلیفوں، مصیبتوں اور درد و غم کے لمحات سے دوچار ہوا ہے۔ اس کی بات اور ہے مگر جب سے اس نے اپنی پُرسوز آواز کا جادو جگایا ہے اس وقت سے لے کر آج تک رفعت مقام بھی حاصل ہے اور شہرت دوام بھی اور نہ صرف اس کی لوح دل میں کئی نام نقش ہیں بلکہ وہ لوگوں کی الواح دل پر نقش ہے۔ وہ جب اپنے مخصوص انداز میں ساز کی دھن پر اپنے لحن داؤدی سے کام لیتا ہے تو وہ بلاشبہ ہر دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ اس کی آواز کا لوچ اور اس کے پس منظر میں جھلکتا بے پناہ درد اہل دل اور اہل عشق کی آنکھوں میں اشکوں کا سیل رواں جاری کر دیتا ہے اور یہ کیفیت کسی کے ہاں پیدا نہیں بھی ہوتی تو پھر بھی وہ ایک ایسی آہ سرد کھینچتا ہے کہ اس کی تاثیر سے عرش والے بھی لرز اٹھتے ہیں۔ عطاء اللہ خیلوی گاتے ہوئے خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رُلاتا ہے۔ یوں وہ ایک تخلیق کار کی طرح اپنی ذات

کے حوالے سے اجتماعی دکھ درد کی تصویر کشی آواز کے ذریعے اس طرح کرتا ہے کہ اس کی آواز کے حوالے سے بکھرتا ہوا سُوز سننے والوں کی سماعتوں سے ٹکرا کر اس کے احساسات وجذبات کے تاروں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اُس کی بے کل صدائیں، گاتے ہوئے ہچکی کا خاص انداز، اس کا ساز غم دل اس کی سسکتی چاہتوں کے تناظر میں چھنا چھن ناچتی صدیوں کے نغمے میں ڈھال دیتا ہے اور اس طرح اس کے نغمہ نکہت فشاں کی لہر کائنات کے وسیع تر پس منظر میں پھیل جاتی ہے۔ تھل کا یہ شہزادہ جب لہک لہک کر گیت گاتا ہے تو گاؤں کی الہڑ دوشیزائیں اُس کے گیتوں اور اس کی آواز کے حوالے سے اپنے محبوب کو پیغام محبت دیتی ہیں۔ اس کی لَے سے ابھرتا ہوا لفظ عاشقوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے اور اُس کی آواز عاشق کی آواز بن جاتی ہے اور وہ جب منوّر علی ملک کا یہ گیت گاتے ہوئے مدھر تان لگاتا ہے۔

ساری رات رُنی ہاں ، پل سکھ نی پایا
سچی ڈس وے ڈھولا کل کیوں نئیں آیا

تو اُس کے حوالے سے عاشق کی کرلاہٹ اور اس کا دکھ درد واضح شکل میں سامنے آجاتا ہے اور ہجر فراق کے ماروں اور انتظار یار میں تارے گننے والوں کی تمام تر کیفیات کی ترجمانی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے یا جب وہ فاروقی روکھڑی کا یہ گیت گاتا ہے۔

کنڈیاں تے ٹُر کے آئے تیرے کول پیر وانے
اگے تیڈی مرضی ڈھولن توں جانے یا نہ جانے

یا جب وہ بے وس کا یہ گیت چھیڑتا ہے

اللہ دی امان ہووی نت نہ ستایا کر
کدی کدی دکھیاں دے درد ونڈایا کر

تو کوئی بھی ذی حس شخص ایسا نہیں جو اس آواز کو سُن کر اپنے دل میں ہوک اٹھتی محسوس نہ کرتا ہو اور جب ہر شخص اُس آواز کو سُن کر جھومتا ہے اور اس کے پس منظر میں پوشیدہ درد اور سوز کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اپنے دل و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں چُھپے ہوئے غم کا حصہ بناتا ہے تو پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ہر دردمند دل میں بستا ہے۔ اُس کی آواز ہر غم زدہ دل کی آواز ہے اور دوستوں کا تو خیر کیا ذکر وہ دشمنوں اور مخالفوں کے دلوں پر بھی راج کرتا ہے بلکہ اپنے دل و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپے ہوئے غم کا حصہ بناتا ہے اور یہ وہ کامیابی و کامرانی ہے جو ہر فنکار کے حصے میں نہیں آتی اور اس سلسلے میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرے وہ کم ہے۔ اس لیے کہ اب تک اس نے جتنے بھی گیت گائے ہیں وہ سارے کے سارے مقبولیت کی انتہائی حدوں کو چھو رہے ہیں اور کوئی گھر بھی ایسا نہیں ہے جس میں ٹیپ ریکارڈ موجود نہ ہو اور اس پر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی کیسٹ نہ لگی ہوئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کے دل پر عشق نے چوٹ لگائی ہو اور جس کا دل روتا ہو، جب وہ شخص خوبصورت آواز میں اپنے جذبات کا اظہار کرے تو اس کی آواز درد کے موسموں کو لے آتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس کی درد بھری آواز کے ساتھ پوری کائنات المیہ گیت گا رہی ہے۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی بھی

جب سرائیکی دوہڑے کا آغاز کرتا ہے تو یقینی طور پر ساری فضا اس کی آواز کی سوگواریت میں ڈوب جاتی ہے۔تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل ارسطو اور افلاطون نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ تخلیقی کام کرنے والوں اور دیوانگی میں تعلق ہوسکتا ہے۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی کی نفسیات کی پروفیسر ڈاکٹر کے جیمس نے اس تصور کو سچ ثابت کیا ہے اور اس نے دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور تخلیقی کام کرنے والوں سے انٹرویوز لئے ہیں اور ویسے بھی فنکار میں ابنارملٹی کا ہونا ضروری ہے۔ بصورت دیگر وہ تخلیقی کام کر ہی نہیں سکتا۔ اعلیٰ درجے کی تخلیق کاری دیوانگی کی لہر کے تحت ہوتی ہے۔عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی بھی موسیقی کا دیوانہ ہے اور اس نے دیوانگی کی حد تک موسیقی کو اپنایا ہے یہ وجہ ہے کہ اُس کی آواز کی لہریں جہاں جہاں بھی بکھرتی ہیں اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتیں۔عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے سرائیکی زبان کو پوری دنیا میں روشناس کروایا ہے اور اس نے سرائیکی کی جو خدمت کی ہے اسے سرائیکی کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ملک بھر کے ہر شہر، ہر بستی، ہر قصبے اور ہے گاؤں کے رہنے والے سب لوگوں کی آواز ہے اور یہ سب لوگ اس کی آواز سے آواز ملا کے کہتے ہیں۔

دھرتی کی سوندھی خوشبو

تنویر ظہور

کوئی ہازیب، ڈھلکے آنچل کو سنبھالے چھن چھن کرتی اپنے آنگن میں دیئے کی لَو کو مدھم کرتی ہے اور دروازے کی اوٹ سے کھیتوں کو بل کھاتے ہوئے جاتے راستے کو دیکھتی ہے۔ جہاں اداس چاندنی بال کھولے سو رہی ہے.....تو اک ہُوک دل کے ویران دریچوں سے بام لب تک آجاتی ہے ..... یا جب ہواؤں میں شبنمی پتوں کی مہکار پھولوں سے لدی ہوئی ڈالیوں کی خوشبو شامل ہو کر سرسوں کے کھیتوں کی شادابی، بہتے جھرنوں کی روانی، بیلوں کے گھنگروں سے ہمکنار ہوتی ہے تو کچے مکانوں سے سُنہرے چاند کی روپہلی اُداس کرنوں میں پیپل کی چھاؤں میں کسی گریباں چاک کے تشنہ ہونٹوں سے ایک صداء، نغمے کی صورت ڈھلتی ہے اور درد کا پیغام بن کر چار سو پھیل جاتی ہے۔گلستان فطرت کے تمام رنگوں اور دلفریب مناظر کو اپنے دامن میں سموئے جذبوں کی رسایہ آواز اپنے مرکز کی جانب مائل بہ پرواز ایک عالم پہ محیط.....ایک طلسم لیے حسن کے نامدار، دل زار کے نامعلوم زخموں پر مرہم رکھ دے تو اس مسیحا نفس آواز کو اس دل سے اٹھتی ہوک اور صدا کو، اس بے چین تان کو لوک گیت کہتے ہیں لوک گیت پنجاب کے پانچوں دریاؤں کی روانی اور ان کے کناروں پر آباد باسیوں کے دلوں پر مرہم اَن دیکھے سپنوں کے بیان کا دوسرا نام ہے۔رانجھے کی ونجھلی سے بہتے ہوئے میٹھے سُر ، ہیر کی پکار، دھرتی کی سوندھی خوشبو کچے گھروں کی مہکار، کنوارے قہقہوں کی چہکار اور وفاؤں کے سچے جذبوں کی عجیب داستانیں، لوک گیتوں کے مجسم روپ میں دل ونظر کی شادابی کا سامان پیدا کرتی ہیں۔لوک گیت شوکت علی کی تان ہے۔ پٹھانے خان، زاہدہ پروین اور منصور ملنگی کا جیتا جاگتا روپ ہے۔حُسن کی اس زنجیر میں جو موتی پرو دیا گیا۔اُس کی چمک نے آنکھوں کی راہِ دل میں جگہ پائی۔لوک کہانیوں، ماہیوں، ٹپوں کے یہ سیدھے سادے جذبے ہر فنکار نے اپنے اپنے انداز میں پیش کئے۔عالم لوہار کا چمٹا ہو یا شوکت علی کی تان، پٹھانے خان کی آواز کا سُر وں میں کمال یا پھر عابدہ پروین کا صوفیانہ کلام میں رموز کو آہنگ کے پیکروں میں تاشنا ، یہ سب ہر فنکار کے اپنے انداز

منفرد کے باعث اسی سے وابستہ ہو گیا۔ لوک موسیقی میں جن فنکاروں نے اپنے فن میں یکتا ہونے کی سند عوام سے وصول کی۔ انہی میں سے ایک معروف نام عطاء اللہ نیازی عیسیٰ خیلوی کا ہے۔ عطاء اللہ نیازی جب سے عوام کے سامنے آئے۔ اس تمام عرصے میں بے پناہ شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ لوک گائیکی کا یہ منفرد فنکار جب اپنے چاہنے والوں سے متعارف ہوا تو اپنے فن کے پس منظر میں ایک کہانی لئے ہوئے تھا۔ کسی چشم غزالاں میں ڈوبنے کی حسرت اور اپنی تشنہ کامی کا قصہ جو اس کے فن کی معراج ثابت ہوا۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا ہے کہ۔

میں کھل کے رو نہ سکا جب تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کہ مجھ سے مگر تو نے کیا کیا ہوگا

عطاء اللہ نیازی نے بھی رونے کی بجائے اپنے دل کا درد گیتوں میں منتقل کرنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ یہ درد اور سوز اس کی پہچان بن کے رہ گیا۔ اس کے گیتوں میں ایک تڑپ ہے اور اس کی آواز وصال یار کے لئے لاحاصل آرزو۔ یہی درد و غم کا اندوہ ہی سننے والے کو اپنا سا لگتا ہے۔

بڑے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر ہی ناکامیوں سے کام لیا

میرؔ کی طرح عطاء نے بھی بڑے سلیقے سے ناکام محبت سے کام لیتے ہوئے اپنے غم کو عالم کا غم بنا دیا۔ لوگ اس کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے ہر بول پر شاید اسی لئے جھومتے ہیں۔

بنوں دی مہندی ، چٹے چٹے ہتھاں اُتے بندھ ماہیا

ایک گلوکار کے لئے شاعر کا کلام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً لوک موسیقی میں شاعری میں انتخاب ایسا ہونا چاہیے جس کی مدد سے لوک فنکار کا پہلا تعارف بھرپور ثابت ہو اور اس کا تاثر دیر پا رہے۔ بیشتر فنکار اپنے پہلے بولوں کے باوصف یک بیک شہرت کے آخری زینے تک پہنچ جاتے ہیں اور ازاں سینکڑوں گیت گانے کے باوجود بھی وہی بول ان کی پہچان یا تعارف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عابدہ پروین نے شاہ اللطیف کا کلام سنایا۔ عالم لوہار نے کہا ''واجاں ماریاں بلایا کئی واروے''۔ شوکت علی نے سیف الملوک کے بول ادا کئے تو منصور ملنگی نے کہا ''اک پھل موتیے دامار کے جگا سوہنیے''۔ ریشماں کے ساتھ ''ہائے اورّبا''۔۔۔۔ مخصوص ہے۔ جب یہ فنکار عوام میں آتے ہیں تو انہی پہلے بولوں کی فرمائش ہر طرف ہوتی ہے۔ عطاء اللہ بھی اُن خوش قسمت فنکاروں میں سے ہے کہ اسے پہلے گیت پر ہی مقبول عام کا شرف حاصل ہوا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ سرائیکی زبان کی شاعری کو عطاء اللہ نیازی نے گائیکی کے لئے منتخب کیا۔ یہ زبان شہد کی مٹھاس اور لطافت کا بیکراں احساس رکھتی ہے۔ سرائیکی شاعری پڑھتے یا سنتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی چمن میں بکھرے ہوئے بے شمار پھولوں کے رنگ دل میں اترتے چلے گئے ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عطاء اللہ نیازی کی آواز کو مقبول عام بنانے میں اس زبان کے رنگوں اور اس کی نرماہٹ کا بہت بڑا حصہ ہے بلکہ آواز سے زیادہ کلام اچھا ہے اور وہی اس کی مقبولیت کا

سبب بھی ہے۔عطاء اللہ نیازی کا ناکام عشق اس کی شہرت کا وسیلہ قرار پانے کے بعد کامیاب شادی پر منتج ہو چکا ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ وہ آنے والے دنوں میں لوک موسیقی میں اپنا کس قدر مقام بنائے گا اور لوک گیتوں کے حسن میں کیا کیا اضافہ کرتا ہے کہ اس حسن کا ایک عام فرد بھی گرویدہ ہے۔لوک گیت نہ صرف ہر سطح اور ہر ذہن پر دیرپا تاثر کا جادو جگاتے ہیں بلکہ سیدھے اور سچے جذبوں کے بیان میں میں قدرت کے حسن کو نغمے کا روپ دیتے ہیں۔نغمے کے اس حسن کو دوام ہو اور حسن ہمہ دل کا حصہ بن جائے کہ یہی بیمار روحوں کا علاج ہے۔غم کو خوشی سمجھنے، ہجر میں وصال کی لذّت کا حاصل لوک گیتوں کے یہی بظاہر عام سے لیکن اپنے اندر معنی کا سمندر لیے ہوئے دو بول ہی تو ہیں۔شاعر نے اسی حسن کی وضاحت میں کہا تھا۔

کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی
مضبوط کشتیوں کو کنارا نہیں ملا

محترمہ گلوکاری صاحبہ

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

ہمیں اتنا تو پتہ تھا کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی صاحب نے اتنی شادیاں کیں نہیں جتنی طلاقیں دی ہیں کہ وہ طلاق بھی یوں دیتے ہیں جیسے دعا دے رہے ہوں۔ایک بار ایک دوست ان کی بیوی کے لئے بازار سے تحفہ لینے گیا۔دکان پر بڑا رش تھا۔دیر ہوگئی تو اس نے آکر سب سے پہلے پوچھا لالہ ابھی تک بھابھی وہی ہے ناں۔ لیکن ہمیں یہ خیال تک نہ تھا کہ وہ محترمہ گلوکاری کو بھی طلاق دے دیں گے ۔پچھلے دنوں میڈم نور جہاں نے یہ انکشاف کیا کہ صرف دو آدمی ہیں جنہیں گلوکاری سے عشق ہے ایک میں اور ایک عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی۔ ہمارے لئے یہ بڑا انکشاف تھا کیونکہ ہم اس سے پہلے میڈم کو آدمی نہیں عورت سمجھتے تھے۔بہر حال گلوکاروں میں صرف عطاء کو میڈم نے آدمی مانا جو بڑی بات ہے۔اگرچہ عطاء کو جو بھی گانا سن کر نکلے وہ یہی کہتا ہے یہ اللہ کی عطا ہے۔ہم نے ہمیشہ اسے اللہ کی عطا ہی کہا۔بہر حال یہ آج پتہ چلا کہ گلوکاری ان کی محبوبہ نہیں زوجہ تھی حالانکہ آج بھی جب کسی کی محبوبہ بھاگ جاتی ہے تو وہ تھانے میں رپٹ بعد میں درج کرتا ہے۔عطاء کی کیسٹیں پہلے خریدتا ہے۔اُس کی کیسٹوں کے بکنے کی تعداد سے ملک میں ناکام عاشقوں کی مردم شماری بلکہ نامردم شماری کی جاسکتی ہے۔

عطاء کو پاکستان کا بچہ بچہ بلکہ بچی بچی جانتی ہے۔وہ اس قدر سچا ہے کہ جس سے پانچ منٹ کے لئے بھی عشق کیا سچا کیا۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس کا ہر جاننے والا اس کے عشق کی ایک نئی کہانی سنائے گا اور اس سے حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ کہانی سچ بھی ہوگی۔ نوجوانی میں اپنے محلے میں پورا ہفتہ جو کرتا۔محلے کا مولوی جمعہ کے خطبے میں وہ سب کچھ سب کو بتا دیتا۔جس سے یہ پتہ چلتا کہ نہ چلتا عطا کیا کرتا ہے۔یہ ضرور پتہ چل جاتا کہ مولوی پورا ہفتہ کیا کرتا ہے۔اس قدر سست ہوتا کہ محلے میں ایک سبزی بیچنے والی تھی ایک دن اس سے سبزی لینے گیا۔اس وقت اس خاتون کا بیٹا دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔جب یہ سبزی لے کر واپس آیا تو وہ لڑکا چوتھی جماعت میں تھا۔

عطاء ایک سیلف میڈ آدمی ہے جن دنوں وہ آرا مشین چلاتا تھا۔ لوگوں کی آرا کے مطابق ان دنوں دو ہی مشہور چیزیں تھیں۔ عطاء اللہ کا آرا اور شمیم آرا۔ فیصل آباد میں ڈرائیونگ بھی کی۔ ایسا ڈرائیور تھا جو تین پہیوں پر گاڑی چلا سکتا تھا یعنی رکشا ڈرائیور تھا۔ بہت محتاط ڈرائیونگ کرتا۔ ایک بار اس کا ساتھی ڈرائیور بہت تیز چلا رہا تھا اس نے کہا اپنی گاڑی میری دعاؤں سے تیز نہ چلاؤ۔ تو ساتھی بولا۔ لالہ! میں خود بہت محتاط ہوں کیونکہ میرے دس چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تو عطاء نے کہا پھر بھی کہتے ہو کہ تم محتاط ہو۔ عطاء نے اتنے حادثے سڑک پر نہیں کئے جتنے گھر میں کئے ہیں اور ہر بار محترمہ گلوکاری نے ہی انہیں بچایا۔ عطاء کو محترمہ گلوکاری سے اس قدر عشق ہے کہ وہ تو عورتوں سے بھری محفل میں آنکھیں بند کر کے گاتا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی کوشش کی۔ چند ایک ایسی محفلوں میں میں ایک آنکھ بند کر کے گاتا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی کوشش کی۔ چند ایک ایسی محفلوں میں ایک آنکھ بند کرنے تک آ گئے ہیں۔ دیکھتے ہیں ان کی دونوں آنکھیں کب بند ہوتی ہیں۔ بہر حال عطاء کی ریٹائرمنٹ کے بعد گلوکاری میں جو خلاء پیدا ہو رہا ہے۔ سنا ہے اسے پُر کرنے کے لئے استاد روشنی خان نے ابھی سے کوششیں شروع کر دی ہیں۔ یقین نہ آئے تو ہر صبح ان کے ہمسایوں کی سوجھی آنکھیں دیکھی جا سکتی ہیں لیکن لوگوں کی رائے ہے کہ ان سے تو سمال سائز کا عوامی سوٹ پُر نہیں ہوتا یہ خلاء کیسے پُر ہو سکتا ہے کیونکہ عابدہ پروین اور نڈرت فتح علی خان ایسے گلوکار ہیں جو بڑی دیر کے بعد پیدا ہوتے ہیں بندہ انہیں دیکھ لے تو دیر کی وجہ سمجھ آ جاتی ہے۔ عطاء میانوالی کی آواز ہے اور اس کی آواز میں میانوالی بلکہ کئی میاں والیاں ہیں۔ وہ تو فیض احمد فیض کی غزل گا رہا ہو بندے کو یقین ہو جاتا ہے فیض احمد فیض سرائیکی شاعر ہیں وہ دل لگا کر گاتا ہے یعنی پہلے دل لگاتا ہے پھر گاتا ہے۔ سانس بھی سر میں لیتا ہے۔ ساری رات وہ اور سُر ایک دوسرے کو جگاتے رہتے ہیں۔ عطاء رات بغیر سوئے تو گزار سکتا ہے مگر بغیر جاگے نہیں۔ جتنی راتیں وہ جاگا ہے اتنے تو ہم دن نہیں جاگے۔ وہ اپنے سننے والوں کے لئے گاتا ہے یوں اس کے گلوکاری سے ریٹائر ہونے کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ فرینک کونکلن نے کہا ہے زندگی ختم کرتے کے جتنے بھی طریقے ہیں ان میں سب سے آسانی ریٹائرمنٹ ہے۔ منور علی نے عطاء پر ایک کتاب لکھی اور کہا یہ تین طرح سے پہلی کتاب ہے۔ عطاء پر پہلی کتاب، میری پہلی کتاب اور برصغیر میں کسی گلوکار پر پہلی کتاب۔ واقعی پڑھنے کے بعد یہ پہلی کی کتاب ہی لگتی ہے۔ اس میں انہوں نے عطاء کو درد کا سفیر کہا ہے۔ سو ہو سکتا ہے عطاء نے اس سفارت سے ریٹائرمنٹ لے لی ہو۔ لیکن یہ اعلان انہوں نے ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' ملنے کی تقریب پذیرائی میں کیا۔ جس سے لگتا ہے انہوں نے یہ ایوارڈ ملنے پر دلبرداشتہ ہو کر یہ قدم اٹھایا ہے کیونکہ جب سے امجد حسین کو پرائیڈ آف پرفارمنس ملا ہے کئی گلوکاروں نے گانا چھوڑ دیا ہے۔ ایک سے ہم نے وجہ پوچھی کیا آپ نے اس لیے گانا چھوڑا کہ آپ کو پرائیڈ آف پرفارمنس نہیں ملا؟ تو اس نے کہا۔ نہیں اس لئے گانا چھوڑا ہے کہ کہیں حکومت ہمیں بھی پرائیڈ آف پرفارمنس نہ دے دے۔

چوپال سُرخرو ہے

افضال شاہد

زندہ رہنے کے لئے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا اور خواہش جب آگے بڑھنے کی ہو تو یار لوگ جائز و ناجائز کے چکر میں نہیں پڑتے اور ''ہل من مزید'' کا نعرہ لگا کر اپنے لئے آسائشوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں میٹرک پاس لڑکا ڈپٹی کمشنر بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ پھر جب میٹرک پاس لوگ کچہریوں میں چپڑاسی بھرتی ہونے لگے تو میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہونے والوں نے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے اور پھر ہوا یوں کہ ملک سے بیماریاں ختم ہو گئیں۔ ہسپتال ویران ہونے لگے قوم کا ہر فرد صحت مند ہو گیا تو میڈیکل کالجوں میں میرٹ بڑھا کر ۹۰۰ نمبروں تک کر دیا گیا۔ ایک دور انجینئر بننے والوں کا بھی گزرا ہے پاسپورٹ آسانی کے ساتھ بننے لگے۔ ویزوں کا حصول ممکن ہو گیا تھا لہٰذا ہر میٹرک پاس کی کوشش ہوتی کہ کم از کم تین ماہ کا ویلڈنگ کا کورس پاس کر کے اور کسی اچھی سی کمپنی میں بھرتی ہو کر سعودی عرب چلا جائے اور وہاں الٹے سیدھے جوڑ لگا کر ملک و قوم کا نام روشن کرے مگر کچھ عرصے بعد سعودی عرب والوں پر بھی ان کی انجینئری کا پول کھل گیا۔ اب واپسی کا عمل شروع ہے اور ہر گلی اور محلّہ میں میوزک سنٹر اور وڈیو شاپس کھل رہی ہیں کہ واپس آ کر بہر حال کچھ نہ کچھ تو کمانا ہی ہے۔ چار برس سعودی عرب میں رہے چار حج کر لیے ابھی بہت کچھ کرنے کی گنجائش ہے۔ سو کر رہے ہیں۔ کچھ برس پیشتر ہمارے ہاں ایک اور وباء پھیلی جب پھٹی ہوئی جینز پہنے گلے میں گٹار ڈالے کانونٹ کا ہر جونیئر کیجی عالمگیر، محمد علی شہکی اور اے نیر بننے پر تلا ہوا تھا اور پھر سسٹرز کا مرض عام ہونے سے پہلے ایک مشکل وقت ہمارے لوک فنکاروں کے لئے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی صورت میں آیا اور یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ مشکل ابھی تک ٹلا نہیں اور نہ ہی اس کے ٹلنے کی کوئی اُمید ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اندازہ اس روز ہوا جب میری عطاء اللہ نیازی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ خیام سرحدی کے ہمراہ میرے دفتر میں آیا۔ مجھے اس کا حُلیہ آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ بکھرے ہوئے بال، سُتی ہوئی آنکھیں، بڑھی ہوئی داڑھی، ہاتھوں میں چار پانچ رنگ برنگے چھلے، اور چند ہی لمحے بعد میرے دفتر میں چپڑاسیوں، جنہیں آج کل نائب قاصد کہتے ہیں۔ آفس اسسٹنٹوں اور دفتری خاتون کلرکوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا اور مجھے یقین ہے کہ اگر عطاء اللہ چند منٹ میرے دفتر میں اور رُکا رہتا تو میرا خشک طبع افسر اعلیٰ میری Explanation ضرور کرا دیتا اور وہ شاید ایسا کروانے میں حق بجانب ہوتا کیونکہ ہمارے سارے دفتر میں کام ہکسر بند ہو گیا تھا۔ عطاء سے پہلے مجھ تک اُس کی داستانیں پہنچ چکی تھیں۔ میں نے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا تو اس کا کھردرا پن محسوس کر کے ایک بار میں نے سوچا کہ اس نے ضرور کوئی نہ کوئی قتل کیا ہے۔ قصے بلاوجہ مشہور نہیں ہوتے۔ میں اس کی اصلیت جاننے کے لئے بے چین تھا اور پھر جب طویل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو مجھ پر یہ کھلا کہ یہ بزدل آدمی تو کسی کے پیسے نہیں مار سکتا اس نے بندہ کیا مارنا ہے۔ اس حقیقت سے بہر حال عطاء کو بھی انکار نہیں کہ شہرت میں ان قصوں کا بڑا ہاتھ ہے جن میں کچھ سچے کچھ لوگوں نے مشہور کئے ہیں اور کچھ شاید اس گراموفون کمپنی کے مالکان نے مشہور کئے ہوں گے جنہوں نے عطاء کے گائے ہوئے المیہ گیتوں کا پہلا کیسٹ ریلیز کیا تھا اور پھر پندرہ بیس کیسٹ ریلیز کر کے عطاء کے پیسے مار لئے تھے۔ اس کے گائے ہوئے گیت چائے کے کھوکھوں،

بسوں، ویگنوں اور سعودی عرب اور دوبئی سے لائے گئے کیسٹ پلیئروں سے لے کر POSH قسم کے ڈرائنگ روموں میں بھی بجتے ہیں۔ وہ ایک عرصے سے تسلسل کے ساتھ گا رہا ہے۔ ٹی وی والوں نے اسے بہترین گلوکار کا ایوارڈ دیا ہے اور اب اس کی شہرت فرضی قصوں اور کہانیوں کی محتاج نہیں اور یوں ہم با آسانی کہہ سکتے ہیں کہ آج کل ہمارے ہاں خیبر سے کراچی تک جو وباء پھیلی ہوئی ہے اسے عطاء اللہ نیازی عیسیٰ خیلوی کہتے ہیں۔ یوں تو ہمارے ہاں جب کوئی وباء پوری طرح معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے تو پھر اس سے بچاؤ کی ترکیبیں سوچی جاتی ہیں مثلاً وی سی آر جب تک اختر امان اور ناہید قوی کی گھر تک نہیں پہنچ گیا اسے قانونی حیثیت دینے کا خیال کسی کو نہیں آیا مگر یہ وباء جو آج ہمارے درمیان سجی سجائی بیٹھی ہے۔ اُس وقت سے ماہرین کے لئے دردسر بنی ہوئی ہے جب سے اس نے معاشرے میں پھیلنا شروع کیا تھا۔ ماہرین کی رائے میں یہ بھی خطرناک وباء ہے۔ اس نے سُر اور تال کی دنیا میں ہلچل مچا دی ہے۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ اسے پولیس یا فوج کا سپاہی ہونا چاہیے تھا یہ گلوکار کیسے بن گیا۔ مگر صاحبو! وہ تو خود اقرار کرتا ہے کہ میں عطائی ہوں۔ نام کے حوالے سے بھی اور فن کے حوالے سے بھی۔ بالکل اسی طرح حبیب عطاء الحق قاسمی نے دین کی تبلیغ کا خاندانی شرف چھوڑ کر شاعری اور کالم نگاری شروع کر دی اور ''عطایئے'' کے حوالے سے خود اپنے عطائی ہونے کا اقرار کر لیا۔ شاید یہ عطاؤں کی عادت ہے۔ اسے آپ ان کی اعلیٰ ظرفی بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپاہ گری

اور یوں وہ بہت سے خاندانیوں کی نسبت جلد مشہور ہو جاتے ہیں اور تشکر کی گردن خم کرتے کرتے ان کی مقبولیت کا گراف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ماہرین ابھی تک اس وباء کے لیے کوئی تیر بہدف ٹیکہ ایجاد کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں مگر ابھی تک ایک بھی گولی تیار نہیں کر پائے۔ مجھے کم از کم اس بحث سے کوئی غرض نہیں کہ عطاء کیسا گاتا ہے میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ کیوں گاتا ہے۔ یہ تو بالکل وہی بات ہے کہ کوئی قاسمی صاحب سے پوچھے آپ شعر کیوں کہتے ہیں۔ منو بھائی سے کہے آپ کالم کیوں لکھتے ہیں کشور ناہید سے پوچھے آپ قہقے کیوں لگاتی ہیں؟

میں عطاء کا دوست ہوں۔ اس کے اندر کچھ دکھ ایسے بھی ہیں جن کا اس سے متعلق مشہور قصوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ ایسے دکھ ہیں جن کا مداوا کرنے کی اس نے کئی بار کشش کیں اور ہر بار ناکام ہوا اور یوں اس کے دکھ بڑھتے ہی رہے۔ ایسی ہی ایک کوشش اس نے حال ہی میں کی ہے۔ خواتین وحضرات! آپ یقین کیجئے کہ مجھ جیسے پیٹ کے ہلکے انسان کے لئے اس خبر کو چھپانے رکھنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا میڈم اندرا کی حکومت کے لئے سورگ باشی بھنڈراں والا کو قابو کرنا۔ اور اس سے پہلے کہ میں باقاعدہ بدہضمی کی تکلیف میں مبتلا ہو جاؤں میں بڑی مسرت کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ میرے اس درویش صفت دوست نے اپنی زندگی کے اس خالی خانے کو بھرنے کے لئے مقبول فلمسٹار بازغہ سے شادی کر لی ہے۔ وہ چوپال کی خصوصی دعوت پر آج یہاں موجود ہیں۔ میں چوپال کے ساتھیوں کی جانب سے اور آپ تمام خواتین وحضرات کی جانب سے عطاء اور بازغہ کو اس ملاپ پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ یہ ملاپ دائمی ہوتا کہ عطاء کو خدانخواستہ پانچویں مرتبہ حتمی شریک زندگی تلاش نہ کرنا پڑے۔ میں ان دونوں کا اس لئے بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے

اس راز کو افشاء کرنے کے لئے چوپال کی اس رنگا رنگ محفل تک انتظار کرنے کی ہمت دلائی اور خدا کا شکر ہے کہ میں سُرخرو ہوں اور میرا چوپال سُرخرو ہے۔

غلطیاں غلط بخشیاں

ناصر زیدی

دائرہ دین پناہ ضلع مظفر گڑھ میں مقیم تنویر شاہد محمد زئی نے ایک خط میں کچھ ادبی اور غلط بخشیوں کے بارے میں ایک دلچسپ انداز میں توجہ دلائی ہے۔ وہ اپنے تعارف میں لکھتے ہیں۔ ''میرا مختصر تعارف یہ ہے کہ لیہ میں پیدا ہوا۔ محترم نسیم لیہ نے مطالعہ کی ترغیب دی۔ شعری راہنمائی ڈاکٹر خیال امروہوی سے حاصل کی۔ والد صاحب کی ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے آبائی قصبہ دائرہ دین پناہ آ گیا۔ یہ ادبی اعتبار سے مروم خیز قصبہ اس لئے بھی ہے کہ یہاں کشفی ملتانی، ریاض انور جعفری، شہید ابن علی، پروفیسر اودے بھانو ہنس جیسے اہل قلم پیدا ہوئے ۱۹۹۱ء کے PTV کے ملی نغموں کے انعامی مقابلوں میں میرا نغمہ بھی انعام کا مستحق قرار پایا۔ لوک گائیک عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کی ادبی وثقافتی تنظیم ''سانول سنگت'' کی بنیاد رکھی۔ تقریباً دس برس ان کے کاروباری امور کا لاہور میں نگران رہا۔ اس دوران ان کے علاوہ پاک و ہند کے کچھ دیگر نامور گلوکاروں نے میرا کلام بھی گایا۔ گزارے لائق چند کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ بہت سی نامور شخصیات سے ملاقات کا اعزاز بھی پایا۔ آپ کا یہ جملہ سہ ماہی ''نیا قدم'' کے ڈاکٹر خیال امروہوی نمبر میں میرے لئے سند امتیاز ہے کہ آپ نے مدیر سے استفسار کیا کہ کیا یہ وہی تنویر شاہد محمد زئی ہیں جنہوں نے ''خبریں'' کے سنڈے میگزین میں اہل قلم کے معاشقوں پر قلم اٹھایا۔ خیر! یہ سب تو ضمناً عرض کیا۔ اس کے بعد طویل کالم کے تراشے کا لب لباب یہ ہے کہ ''عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی سرائیکی زبان کے لیجنڈ لوک گائیک ہیں۔'' انہیں احباب پیار سے ''لالہ'' بھی کہتے ہیں ان کا شعری ذوق عمدہ ہے۔ وہ گانے کے لئے کلام کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ بیشتر لکھنے والے ان کی جان پہچان کے اور اپنے علاقہ کے ہیں انہوں نے جو اردو کلام گایا وہ بھی مقبول ہوا۔ اس وقت مجھے ایک خاص غزل کا تذکرہ کرنا ہے جو اتفاقیہ میرے سامنے آ گئی۔ اس معروف غزل کے بول ہیں۔

تُو بھی کسی کا پیار پائے خدا کرے
تجھ کو ترا نصیب رُلائے خدا کرے

اس نظم یا گیت کے خالق ہندوستان کے معروف شاعر اویس احمد دوراں ہیں۔ اُن کی یہ خوبصورت نظم ''اِک بے وفا کے نام'' سے ۹۔۱۹۵۸ء میں ماہنامہ ''شمع'' دہلی میں شائع ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد کلکتہ کی ایک شاعرہ نیلوفر ناہید نے اس نظم کا چربہ کر کے اسے ماہنامہ ''ساز'' کلکتہ میں اپنے نام سے شائع کرا دیا۔ ۱۹۶۵ء میں یہ نظم ماہنامہ ''شباب'' لاہور میں نسرین نقوی سید کے نام سے من وعن شائع ہوئی۔ اسی سال کلکتہ میں آل انڈیا میوزیکل کانفرس میں مکیش اور لتا منگیشکر نے اس نظم کو شاعر سے اجازت لئے بغیر گایا۔ ۱۹۸۷ء میں یہ نظم کسی اور کے نام سے ماہنامہ ''گلابی کرن'' نئی دہلی میں شامل ہوئی۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز میں جب یہ کیسٹ ریلیز ہو کر

متحدہ عرب امارات میں ان کے چاہنے والوں کے ہاتھوں تک جا پہنچتی تو انہوں نے جو کلام گایا۔ اس میں بعض مصرعے اویس احمد دوراں کے تھے۔ آخری شعر البتہ من وعن انہی کا تھا۔ صرف دوسرے مصرعے کا ایک لفظ ''آنچ''، ''حرف'' سے بدل دیا گیا تھا۔ اویس احمد دوراںؔ اس دوران مختلف رسائل و جرائد میں احتجاج کرتے رہے لیکن نہ تو ان کی شنوائی ہوئی اور نہ ہی کسی شاعر نے ان کے دعویٰ کی تردید کی۔ ۱۹۸۷ء میں بھارت کے معروف فلم پروڈیوسر گلشن کمار نے ''بددعا'' کے عنوان سے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز میں یہ گیت دوبارہ تیار کر کے والیم نمبر ۲۹ گل مہر پارک نئی دہلی سے ریلیز کر دیا۔ کاپی رائٹ ایکٹ انڈیا کے سیکشن نمبر ۵۱ اور سیکشن نمبر ۶۱ کے تحت مصنف کی اجازت کے بغیر کسی کو یہ حق نہیں پہنچا تا کہ ایک مصرعہ بھی چرائے یا کاروباری مقاصد کے تحت اس کا استعمال کرے۔ اسی استحقاق کے تحت اویس احمد دوراںؔ نے ۳۰ جون ۱۹۹۴ء کو اپنے وکیل کے ذریعے گلشن کمار کو نوٹس بھی بھجوایا۔ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ میں اس تو لاعلم ہوں لیکن ان معروضات کی روشنی میں یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس نظم کے اصل شاعر اویس احمد دوراں ہی ہیں۔ یہ نظم ۱۴ شعروں پر مشتمل ہے جو اُن کے شعری مجموعے ''لمحوں کی آواز'' میں بھی شامل ہے۔ اس میں سے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

تیرے بھی دل میں ہُوک سی اٹھے خدا کرے
تو بھی ہماری یاد میں تڑپتے خدا کرے
مجروع ہو بلا سے ترے حسن کا غرور
پر تجھ کو چشم شوق نہ دیکھے خدا کرے
کھو جائیں تیرے حسن کی رعنائیاں تمام
تیری نوا کسی کو نہ بھائے خدا کرے
میری ہی طرح کشتی دل ہو تری تباہ
طوفان اتنے زور کا اٹھے خدا کرے
آئیں نہ تیرے باغ میں جھونکے نسیم کے
تیرا گل شباب نہ مہکے خدا کرے
ہر لمحہ تیری روح کو اک بے کلی سی ہو
اور بےکلی میں نیند نہ آئے خدا کرے
ہو تیرے دل میں میری خلش، میری آرزو
میرے بغیر چین نہ آئے خدا کرے
تو جا رہی ہے بزم طرب میں تو خیر جا
پَر تیرا جی وہاں بھی نہ بہلے خدا کرے

المختصر ہوں جتنے ستم تجھ پہ ٹوٹ جائیں
لیکن یہ ربط زیست نہ ٹوٹے خدا کرے
جو کچھ میں کہہ گیا ہوں جنوں میں وہ سب غلط
تجھ پر کوئی بھی آنچ نہ آئے خدا کرے
تو ہے متاع قلب و نظر بے وفا سہی
ہے روشنئی داغ جگر بے وفا سہی

اسی طرح عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا ایک اور معروف زمانہ گیت ہے۔ ''ہماری شرط وفا یہی ہے، وفا کرو گے وفا کریں گے'' یہ اُن کی کیسٹ کا ٹائٹل گیت ہے اور شاعر کا نام نصیر احمد ہے۔ میں ذاتی طور پر موصوف سے واقف نہیں ہوں۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء میں ہندوستان سے پروفیسر یوبی ہنس اور معروف شاعر مہندر پرتاب چاندا اپنی جنم بھومی کی زیارت کے لئے تو انہوں نے ایک طویل خصوصی نشت میں مجھے اپنی کتاب ''اجالوں کے سفیر'' عنایت فرمائی۔ جس میں ان کا ایک مضمون ''علامہ قیس جالندھری کے استادانہ کمالات'' پڑھتے ہوئے چونک گیا۔ اس میں اس غزل کے دو شعر شامل تھے۔ میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ علامہ امر چند قیس جالندھری آنجہانی (۱۹۰۲ء..... ۱۹۹۴ء) ایک معتبر ممتاز اور مستند شاعر تھے۔ ان کے دیگر اشعار میں بھی یہی رنگ نمایاں تھا۔ اس وقت انہیں یہ غزل مکمل یاد نہیں تھی ان کے مطابق مذکورہ غزل گیارہ اشعار پر مشتمل تھی۔ میری درخواست پر انہوں نے واپس جانے کے بعد یہ وعدہ وفا کیا اور ۱۹ اشعار جو دستیاب تھے۔ پہلی فرصت میں خط کے ذریعے روانہ کر دیئے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ہماری شرط وفا یہی ہے وفا کرو گے وفا کریں گے
ہمارا ملنا ہے ایسا ملنا، ملا کرو گے ملا کریں گے
کسی سے دب کر ہم نہ رہیں گے ، ہمارا شیوہ نہیں خوشامد
بُرا کہو گے، بُرا کہیں گے، ثنا کرو گے، ثنا کریں گے
ہمارا پینا پلانا کیا ہے ؟ ہمارا پینا پلانا یہ ہے
پلاؤ گے تم، پلائیں گے ہم، پیا کرو گے، پیا کریں گے
یہ پوچھنا کیا کہ خط لکھو گے؟ یہ پوچھنے کی نہیں ضرورت
تمہاری مرضی پہ منحصر ہے، لکھا کرو گے، لکھا کریں گے
ہمارے محبوب سینکڑوں ہیں، تمہارے شیدا ہزاروں لیکن
نہ تم کو شکوہ نہ ہم کو شکوہ گلہ کرو گے، گلہ کریں گے
ہم اپنی ہستی پہ رکھتے ہیں حق یقیناً اتنا ہی حق تو یہ ہے

سمجھ کے فاضل اگر اسے تم، فنا کرو گے، فنا کریں گے
ہماری مجبوریاں تو دیکھو، کیا ہے کتنا ذلیل وعدہ
عدو کی منت، مری خوشامد، کیا کرو گے، کیا کریں گے
یہ کہہ دیا قیسؔ اُن سے ہم نے، ہماری غیرت کا دھیان رکھنا
وفا کرو گے، وفا کریں گے، جفا کرو گے، جفا کریں گے

اس غزل میں گو معمولی سی تحریف کی گئی ہے لیکن وہ اس قدر نہیں کہ اسے چربہ ثابت نہ کیا جا سکے۔ ان معروضات کی روشنی میں محترم عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ گو مذکورہ کیسٹوں پر اصل شعراء کے اب نام درج کرانا خاصا مشکل ہوگا لیکن اگر اپنی ویب سائٹ پر ان کی دادرسی فرمائیں تو یقیناً ان کے ان گنت چاہنے والوں کے لئے نہ صرف ایک خوشگوار انکشاف بلکہ خوشی کا باعث ہوگا اور ان کا ریکارڈ بھی درست رہے گا۔

عیسیٰ خیلوی کے لئے تالیاں

قاضی واجد

پاکستان میں جن صاحبان کے لئے تالیاں بجائی جاتی ہیں۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ان کی پہلی صف میں شامل ہیں۔ اس لئے ان کے لئے تالیوں کی فرمائش بظاہر عجیب لگتی ہے لیکن میں اُن کی شخصیت کے ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کا ذکر کم ہی ہوا ہے۔ خاموشی کے ساتھ وہ ایک ایسی خدمت سرانجام دے رہے ہیں جو شاید بڑے بڑے اداروں نے بھی نہ انجام دی ہو۔ یہ جملہ جو میں نے لکھا ہے بہت ہی گھسا پٹا ہے اور روایتی قسم کی طرح جب کسی فرد کی خدمات کا ذکر کرنا مقصود ہو تو عام طور پر اس جملے کو استعمال کر لیا جاتا ہے۔ لیکن عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی جس خدمت کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ واقعی قابل قدر ہے۔ اس لئے فوراً ہی شکوک وشبہات کے پیدا ہونے سے پہلے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ عیسیٰ خیلوی صاحب نے ایک بہت ہی فعال ادبی وثقافتی تنظیم سانول سنگت کے نام سے قائم کر رکھی ہے جس کی شاخوں کی تعداد اب تک ۲۰۵ تک پہنچ چکی ہے۔ چونکہ کسی گاؤں، قصبے یا شہر میں اس تنظیم کی شاخ قائم کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تنظیم کا پھیلاؤ دوسو زائد دیہات، شہروں اور قصبوں تک جا پہنچتا ہے۔ خاص طور پر جنوبی پنجاب میں سانول سنگت زیادہ فعال ہے۔ اس دور افتادہ اور پسماندہ علاقے میں وہ ادب، فنون لطیفہ اور ثقافت کی ترویج وترقی، بلکہ یوں کہیے کہ انہیں متعارف کرانے میں ایسا کردار ادا کر رہی ہے جو قبل ازیں کسی اور تنظیم یا ادارے نے نہیں کیا۔ سانول سنگت تعلیم یافتہ نوجوانوں اور گمنام لوگوں کو منظر عام پر لاتی ہے انہیں منظّم کرتی ہے اور جنوبی پنجاب کی محرومیوں سے ماری ہوئی تلخ اجتماعی زندگی میں ہنسنے کھیلنے کے چند لمحے مہیا کر دیتی ہے۔ جنوبی پنجاب کے صحراؤں میں پھول اگانے والی اس تنظیم کے اب تک میانوالی، لیّہ، ملتان، فیصل آباد، لاہور ڈیرہ اسمٰعیل خان، خان پور اور کوہ مری میں مرکزی کنونشن منعقد ہو چکے ہیں۔ ان مرکزی اجتماعات میں ادب وثقافت کے مختلف شعبوں

میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں میں سانول ایوارڈ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور عزت افزائی بھی اور دوسرے لوگوں میں بھی کچھ کرنے کی تحریک اور امنگ پیدا ہوتی ہے۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نہ صرف سانول سنگت کے مرکزی چیئر مین ہیں بلکہ وہ اس کے لئے بہت سے مالی فنڈ زبھی مہیا کرتے ہیں۔ سنگت کے چیف آرگنائزر تنویر شاہد محمد زئی ہیں۔ سنگت ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایوارڈ دینے کا فیصلہ کر چکی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ بعض سرائیکی شعراء کو سنگت کی طرف سے وظائف بھی دیئے جا رہے ہیں۔ سال رواں کے آخر میں خان پور میں سنگت کا مرکزی کنونشن منعقد ہونے والا ہے جس کے لئے تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ سانول سنگت کے مرکزی سیکرٹری اطاعات حبیب اللہ خیال اس سلسلے میں گزشتہ روز لاہور آئے تھے تو میں نے یہ معلومات بھی ان سے حاصل کی تھیں۔ میری دعا ہے کہ سانول سنگت کی یہ کوشش پہلے سے زیادہ کامیاب ہو اور عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی جنوبی پنجاب کے صحراؤں میں جو ثقافتی لہر پیدا کر رہے ہیں وہ اس علاقے کو سیراب کر دے۔

فنِ موسیقی کا سادھو

محمد منصور آفاق

عطاء پر کچھ لکھتے ہوئے میرے ذہن میں موسیقی کے بہت سے سر جاگ اٹھے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ میانوالی جیسے پسماندہ شہر کا یہ گلوکار سنگیت کی ان کٹھن راہوں سے اپنے وجود کا اعتراف کیسے کرا رہا ہے۔ اس کے ہاں بھیرویں، سندھڑی، تلنگ، پہاڑی، جوگ، بھیسم، چھایانٹ، غرضیکہ سب کچھ ہے۔ اس رتن دیوی کی تنظیم کتاب ''کشمیر اور پنجاب کے تیس گیت'' نہیں پڑھی۔ لیکن موسیقی کی ہر اصلاح پر مکمل عبور رکھتا ہے۔ معلوم نہیں اِسے کس نے بتا دیا کہ جھلی، جوڑی، جوڑی، گھنگھرو، گھڑتال، گھگ، ڈھٹہ کنگ اور اکتارہ جیسے لوک سازوں کو رُباب، طاؤس، سارنگی، سرمنڈل اور پکھاوج میں بھی بولا جا سکتا ہے۔ عطاء کے پاس وہی ساز ہیں جو ہر لوک موسیقار کے پاس ہوتے ہیں لیکن اس کی انگلیاں اس کی آواز سے ہم آہنگ ہوتی ہیں تو وجھلی اور رُباب ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ جوڑی، طاؤس سے بوس و کنار کرتی ہے ن۔ گھنگھرو، سارنگیوں سے کھیلتا ہے اور یوں ایک ایسا بہشت گوش آباد ہو جاتا ہے جسے چھوڑ کر جانا ابن آدم کے بس سے باہر ہے۔ وہ گاتا ہے اور زندگی چیخ اٹھتی ہے کہ لہراتے رہو.....گاتے رہو اس وقت عطاء کی شدت کرب سے رُندھائی آواز لذت سوز جگر کی سرخوشی بخش رہی ہوتی ہے۔ عطاء کے ہاں درد کی لذت اپنے ارتقاء کو پہنچ چکی ہے۔ اب اس کی سسکاریوں اور کراہوں کی لذّتیں ایسی ہیں جیسے اپنے ہاتھوں سے کوئی اپنے زخم کرید کرید سکون محسوس کر رہا ہو۔ یونانی دیومالا میں کنگ آسٹر ایک شُتّر مُرغ کی قسم کا جانور نما پرندہ ہین جو اپنی چُونچ سے اپنا زخم خود نوچ رہا ہے۔ میرے خیال میں عطاء جب گاتا ہے تو اس میں اس کی سسکیوں پر سر دُھننے والوں میں اور کنگ آسٹر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس وقت ہر شخص دل کے پرانے پھپولوں کے زخم کرید رہا ہوتا ہے اور پھر اس کرب کی لذت سے عجیب سا قرار محسوس ہوتا ہے خواہ اس کی پلکوں پر ست رنگی ستاروں کے فانوس ہی کیوں نہ لٹک رہے ہوں۔

کرب کی لذت انوکھا سا سکوں لانے لگی
دل سے لے کر آنکھ تک اک موج خوں لانے لگی

فنی خلوص کو فنکار عبارت سمجھتا ہے اور اس کا اظہار اتنا نازک فریضہ ہے جس سے عہدہ بُرا ہونا اسی صورت میں ممکن ہے جب فنکار اپنے اشتہار کے لئے نہیں بلکہ اپنے اندر سُلگتے ہوئے شخص کی ضِدوں کو باہر کی دنیا کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائے۔ عطاء فن کا سادھو ہے اسے اپنے لوک ورثہ سے عقیدت ہے وہ اس ورثے کو خون جگر میں ڈبو کر لوگوں کے حوالے کر رہا ہے۔ اس نے لوک شاعری کو اپنی آواز کے جادو سے نئی زندگی عطا کی ہے۔ عطاء جب بھی ''لالہ جاگ'' گاتا ہے تو ہماری ثقافت جاگ کر اس کی آواز کے سحر میں کھو جاتی ہے میرا خیال ہے وہ اس عطاء کی آواز نہیں رہتی۔ میرے پورے معاشرے کے ہر دھڑکتے دل کی حسین دھڑکن بن جاتی ہے۔ عطاء لوک گیت گاتا ہے کیونکہ لوک گیتوں کی شاعری اصل اور حقیقی شاعری ہے۔ میں فرانس کے دانشوروں کے گونگے فن و ادب کو بیمار بنجر سوچوں کی خستہ حال فصل کہتا ہوں۔ اردو ادب کے اس معیار پر شیکسپیئر کی تمثیلوں، میتھو ون کے نغموں کو بیکار تصور کرتا ہوں۔ کیونکہ گونگے فن و ادب کا زندگی سے کوئی رشتہ نہیں۔ فن کا مقصد صرف یہ ہے کہ عوام کو مسرتوں کی کمک عطا کی جائے اور گونگا اور بے زبان ادب و فن دیو مالائی حکایات پر مبنی ایک تصوراتی دنیا کا بھٹکا ہوا شوق ہے لیکن فن نہیں ہے۔ فن تو وہ ہے جو عطاء کی آواز سے ہم آغوش ہو کر وجود میں سرایت کر جاتا ہے اور درد کی ایک لہر سی دل وحشی میں تڑپ تڑپ جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ وہی اشک ہیں جو میری سنسان آنکھوں تک نہیں پہنچ سکے اور یہ وہی مضطر آہیں ہیں جو میرے حلق سے نہیں پھوٹ سکیں اور پھر یہی آنسو مجھے دیوان غالب تک لے جاتے ہیں جس میں لکھا ہے

باور آیا مجھے پانی کا ہوا ہو جانا

بے مہر آنسوؤں کا پانی جب ہُوا ہو جاتا ہے تو بہت سے دکھیارے دلوں کی کرب زدہ چیخیں اس میں پناہیں تلاش کرنے لگتی ہیں اور بہت سی صبر شکن آہیں ضبط کے سارے بندھن توڑ کر اپنی راہیں تراشنے نکل پڑتی۔ گلوکاری ایسی ہی ایک خوش کام کوشش ہے اور سب سے خوبصورت گلوکار وہی ہوتا ہے جو اپنی مٹی کے خمیر کا حق ادا کر کے اس کا ضمیر بن جاتا ہے۔ عطاء نے یہ حق ادا کر دیا اور وہ میانوالی کی پہچان بن گیا۔ وہ ایک ایسا جادو ہو گیا جس پر دل بھی ناز کرتا ہے وہ اتنی میٹھی سسکاری ہے جس پر لاکھوں گھٹی گھٹی کراہوں کو پیار آجاتا ہے۔ عطا ایک فنکار ہے جسے خود فنکاری تلاش کر کے اس پر نثار ہو گئی ہے۔

جو عطا کرتا رہا ہے درد کا پروردگار
مصحف دل پر وہ ساری آئتیں لکھتا گیا

تلاش کے لفظ سے مجھے ''دنیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار چیخوف یاد آجاتا ہے۔ جس نے دنیا کو بتایا تھا کہ فنکار دراصل کسی چیز کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اسی تلاش میں تمام کائنات کو چھان مارتا ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک تمام جانوروں کے دلوں کو ٹٹولتا ہے اور انسانوں کی طرف متوجہ ہو کین آدم و حوا کی نبضوں پر انگلیاں رکھ دیتا ہے مگر کہیں بھی اس کو اس کی تلاش کا ثمر نہیں ملتا۔ وہ اتنی بڑی کائنات میں

اپنے آپ کو.....اپنی ذات کو تلاش کرتا ہے اور جب وہ اپنے آپ کو ڈھونڈ لیتا ہے اور اس کی تلاش فیروز مندیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار ہو جاتی ہے تو فن اس پر قربان ہو جاتا ہے۔

ایک کریہہ الفطرت شخص نے عطاء کی میانوالی کا شناختی کارڈ کہا تھا۔ ہائے اُس شخص کو کون سمجھائے کہ عطاء تو خود ایک چلتا پھرتا میانوالی ہے۔ دنیا کے آخری کونے ناروے میں بھی جب کسی کیسٹ سے عطاء کی آواز اٹھتی ہو گی تو سننے والے کے ذہن میں دو نام ابھرتے ہوں گے۔ پہلا پاکستان اور دوسرا میانوالی، عطاء میانوالی کی سرزمین سے جنم لینے والا ایک عظیم فنکار ہے۔ وہ آج کل میانوالی سے دو میل دور لاہور میں رہ رہا ہے لیکن اب تمام میانوالی اس میں رہتی ہے بلکہ میانوالی پر کیا موقوف اس کے اندر تو پورا پاکستان بستا ہے۔ عطاء کا ایک کریڈٹ یہ بھی ہے کہ اس کی آواز نے سرائیکی کو اس مقام رفیع سے نوازا ہے جہاں تک پہنچانے کے لئے سرائیکی دانشوروں کو صدیوں درکار تھیں۔ عطاء نے اپنی مادری زبان کو زریعہ اظہار بنا کر اس خوبصورت انقلاب کی داغ بیل ڈالی ہے کہ آج خصوصاً میانوالی کے لوگ اپنی زبان بولنا باعث فخر سمجھتے ہیں ورنہ کل کلاں تک وہ اس محرومی احساس کا شکار تھے کہ یہ زبان نہیں ہے اور جاہلوں، گنواروں کی بولی سمجھتے تھے مگر آج اس کے برعکس سرائیکی ایک کلاسیکل زبان کی حیثیت سے اپنا وجود تسلیم کرا رہی ہے۔ آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ عطاء آوازوں کے منظر نامے میں ایک واضح ترین اور منفرد آواز ہے جو ساز کے زیر و بم سے مل کر اس عالم جوش کو جنم دیتی ہے جس کی طرف خواجہ شیراز نے اشارہ کیا تھا۔

چہ راہ می زندایں مطرب مقام شناس
کہ درمیان غزل قول آشنا آورد

بیٹی برہمن کی کیا جانے ماس کا سواد

عارش خان

سندھیوں کی ایک بڑی مزیدار کہاوت ہے کہ لنگڑوں کے دیس جاؤ تو اپنی ایک ٹانگ کندھے پر دَھر لو۔ مگر عطاء اللہ خان نیازی جب آبائی مسکن سے چلا تو ایک ٹانگ کندھے پر دھرنے کی بجائے دو ٹانگیں مزید لگا لیں۔ اور سوانگ بھرا کہ دنیا کے تمام فیشن فلاپ ہو کر رہ گئے۔ بڑے بڑے بے ترتیب بال، نوچا ر کی لٹکی ہوئی مونچھیں، ہاتھوں کی انگلیوں سے دُگنی تعداد تعداد میں انگوٹھیاں، لباس ایسا کہ دیکھنے والے نہ ملنگ کہہ سکیں نہ سودائی۔ شنید ہے کہ اس زمانے میں کپڑے تبدیل کرنے کا طریقہ یہ اختیار کر رکھا تھا کہ انہی کپڑوں کو اتار کر دو بارہ پہن لیا کرتا تھا۔ بعد ازاں اونٹ نے کروٹ بدلی اور اب یہ نوبت آ پہنچی ہے کہ اس کی کمائی کا ۳/۱ حصہ باڑے کے بزازوں اور ۳/۲ حصہ درزیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے عطاء کی وہ حالت کسی تازہ زخم کا نتیجہ ہو مگر یہ بھی ممکن ہے اس نے اظہر غوری کی طرح خود کو منفرد بنانے کے لئے یہ بہروپ بھرا ہو۔ مجھے مضمون لکھتے وقت اس بات کا پورا احساس تھا کہ حاضرین میں سے بیشتر عطاء کے

پرستار ہوں گے چنانچہ خوف فساد خلق سے محض سیاہ وسفید کو سفید وسیاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی کہیں عطاء کے ٹپوں، ماہیوں پر زد پڑ جائے تو اسے فکشن کا سقم تصور کیا جائے۔ کئی برس ادھر کی بات ہے میں دوستوں کے ہمراہ فیصل آباد سے پنڈی جا رہا تھا کہ تیل کی گھوڑی مسافروں سے روٹھ گئی۔ ناچار سب اترے اور جہاں جس کے سینگ سمائے راہ سفر اختیار کرتے رہے۔ رات کا وقت تھا۔ سامنے سے ایک کار کی لائٹوں نے آنکھوں کو سڑک کی راہ دکھائی۔ لفٹ کے لئے ہاتھ دیا اور کار نے پنڈی تک کی لفٹ دے دی۔ کار میں بیٹھے ہی تھے کہ میزبان نے عطاء اللہ نیازی کا کیسٹ لگا دیا۔ ابھی غزل بھی پوری نہ ہو پائی تھی کہ ایک دوست نے چٹاخ پٹاخ مکالمہ دے مارا بھیا یہ رونے دھونے والی بکواس کیسٹ بند کر دیجئے ورنہ پنڈی تک کا سفر حرام ہو جائے گا اور اسٹیرنگ پر بیٹھے محسن نے کیسٹ بند کر دیا۔ چند میل کے سفر کے بعد ایک ہوٹل پر چائے نوشی کے لئے پڑاؤ ڈالا۔ ہوٹل کی روشنی میں پہنچتے ہی دل دھک کر کے رہ گیا۔ لفٹ دینے والا مہربان عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی تھا۔ بڑی شرمندگی ہوئی۔ جس دوست نے کیسٹ بند کرایا تھا سیاستدانوں کی طرح پینترہ بدل کر بولا۔ ارے آپ عطاء اللہ نیازی ہیں۔ بھئی بہت اچھا گاتے ہیں آپ۔ کیا گلا پایا ہے۔ ماشاء اللہ کیا سوز و گداز ہے۔ میں اس وقت تک ہوٹل سے ہٹ کر سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا تاکہ کسی دوسری کار سے لفٹ لینے کا بندوبست کیا جا سکے مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ چائے کا بل بھی عطا نے اصرار کرتے ہوئے اپنی جیب سے ادا کیا۔ یہ عطاء کے ساتھ میری پہلی ملاقات تھی اور گواہ ہے آج دوسری ملاقات ہے۔ ہاں ان دو ملاقاتوں کے درمیان آبادی کم کرنے کی مہم پر لگائی گئی تیز رفتار ویگنوں سے عطاء کی آواز مجھ تک ضرور پہنچتی رہی اور انہی دو ملاقاتوں کے درمیانی عرصہ میں عطاء کی آواز اور دو گلوکاروں کے پرستار کی جنگ بھی دیکھی۔ ان میں سے ایک مہدی حسن کا پرستار تھا اور دوسرا نیازی کا شیدائی۔ دونوں ایک دوسرے کے گلوکار پر اعتراضات کے ڈھیلے برسا رہے تھے۔ نیازی کا شیدائی بولا کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی گیت گاتا ہے جبکہ مہدی حسن موسیقی اور معدے کے مشترکہ امراض میں مبتلا ہے۔ اس پر مہدی حسن کا پرستار تنک کر بولا۔ ارے جا جا تو بیٹی برہمن کی کیا جانے ماس کا سواد، کبھی مہدی حسن کو غور سے سُن، گلے میں بھگوان بولتا ہے۔ عطاء کا پرستار کچھ جذباتی ہو کر بولا۔ ارے مہدی کے گلے میں بھگوان بولتا ہے۔ تو عطاء اللہ کے گلے میں نتھیا گلی بولتی ہے اور پھر وہ گھمسان کی بخشا بخشی ہوئی کہ منہ لگائی ڈومنی کوئے ملامت سے تال بے تال گاتی ڈھولک بجاتی نکل گئی۔ اُس روز میں نے پہلی مرتبہ عطاء اللہ کا کیسٹ خریدا تاکہ اس کو غور سے سن کر اندازہ کر سکوں کہ کس کے گلے میں کیا کیا بولتا ہے۔ راستے میں ایک دوست مل گیا اور اپنے گھر لے لیا گیا۔ میں نے وہیں عطاء کا کیسٹ لگا دیا۔ دوست نے بڑا منہ پھاڑ کر پہلے ہی مصرعہ پر جماہی سے داد دی اور انترے کو تو خراٹوں پر اٹھا لیا۔ میں نے اس کا شانہ ہلا کر کہا، یار اتنا مقبول گلوکار ہے ذرا سنجیدگی سے سن اور مجھے بتا بھلا اس کے گلے میں کیا بولتا ہے اس نے دوبارہ جماہی لیتے ہوئے کہا۔ قسم خدا کی میں اس کے تین گیت مسلسل سن لوں تو جسم پر پتی اُچھل پڑے گی میرے دوست نے کسر نفسی سے کام لیا تھا۔ عطاء اللہ کے تین گیت نہیں ایک گیت بھی سُن لیا جائے تو پتی نہیں پتا اُچھل پڑتا ہے۔ عطاء سے متعلق ایک واقعہ گزشتہ دنوں اس وقت پیش آیا جب میں اس تقریب کے سلسلہ میں اپنے حصے میں آنے والے دعوت نامے تقسیم کرنے نکلا اور پاک ٹی ہاؤس میں نوجوان مصور آصف خان کو دعوت نامہ دیا۔ اس نے دعوت نامہ پڑھا اور میری طرف دیکھ کر بولا یار شوکت علی کو تو اس لئے برداشت کر لیا تھا کہ اس کا اخلاق بہت اچھا ہے لیکن یہ تم مجھے عیسیٰ خیلوی

کس سلسلہ میں سُنوار ہے ہو۔ کہا مائی باپ اس کا جرم معاف کر دیجئے۔ بیچارہ عطائی ہے۔ بولا۔ نہیں اُس سے تو میری کوئی دشمنی نہیں لیکن تم گردن زدنی کرا بیٹھو گے۔ اور میں خوف زدہ ہو کر سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کچھ لوگ عطاء کے پرستار ہیں تو کیوں؟ اور بعض اس سے نالاں ہیں تو کیوں؟

درحقیقت عطاء اللہ ٹوٹے ہوئے شکستہ رومانوں کا رونا روتا ہے۔ بدشکل محبتوں کا ماتم کرتا ہے۔ وہ محبت جو آجکل کے دور میں Exist نہیں کرتی۔ میرا دور کمپیوٹر کا دور ہے اور مجھے قصے کہانیوں داستانیں نہیں وی سی آر کے غیر ملکی کیسٹ عشق کا درس دیتے ہیں کہ تُو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ پھر میں عطاء کے ساتھ کیوں اتفاق کروں۔ آج کا عشق تو کمپیوٹرائزڈ ہو چکا ہے۔ ویسے پی آر جتنی زیادہ ہو گی اتنی ہی زیادہ کامیابیاں عطاء کے ماتمی گیت سن کر اس بات کا یقین ہونے لگتا ہے کہ جس سنہ میں یہ پیدا ہوا۔ اس سنہ میں ضرور کوئی بین الاقوامی حادثہ پیش آیا ہو گا۔ جس کے اثرات عطاء کے برج پر براہ راست مرتب ہوئے ہیں۔ عطاء کا رونا دھونا کم از کم عشق کے معاملے میں آج کے دور سے مطابقت نہیں رکھتا اور شاید یہی وجہ ہے کہ ایک کلاس عطاء سے نالاں ہے مگر دوسری کلاس اس کے شیدائیوں پر بھی تو مشتمل ہے اور اپنے ان پرستاروں میں عطاء بے حد مقبول ہے اور جو مقبول ہوتا ہے اس کے پاس کچھ ضرور ہوتا ہے۔ عطاء کے پاس بھی ضرور کوئی گیدڑ سنگھی ہو جو اس نے ایک کلاس کو دکھا کر تو اپنے پیچھے لگا لیا ہے اور دوسری کلاس کو نہیں دکھاتا۔ دراصل موسیقی کی میٹھی مار بھی شوخ آنکھ، پُرکار عورت اور دلیر کے وار کی طرح کبھی خالی نہیں جاتی۔

نین چھپائے نہ چھپیں پٹ گھونگٹ کی اوٹ
چَتر نار اور سُورما کریں لاکھ میں چوٹ

عطاء نے بھی موسیقی اور معدے کے امراض میں مبتلا متعدد سور ماؤں کے درمیان کھڑے ہو کر تان لگائی ہے اور خاندانی گلوکاروں کے نرغے میں کھڑے ہو کر اپنے لئے بنائی ہے۔ جس طرح بچھو کا کاٹا روتا اور سانپ کا کاٹا سوتا ہے۔ آج کل اسی طرح غلام علی کا کاٹا سوتا ہے اور عطاء اللہ کا ڈسا روتا ہے اور روتا ہی چلا جاتا ہے۔ عطاء اللہ کے انداز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے دیہی گیت کو دیہی لہجہ دینے کے ساتھ ساتھ عطاء کی کامیابی میں اس کی محنت و ریاضت اور جدوجہد بھی شامل ہے کہ اس نے بھی۔

بار الم اٹھایا رنگ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یونہی انداز بے حسی کے

لیکن یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ خوش دلی کی ایک منزل بے حسی سے پہلے پڑتی ہے اور ایک اس کے بعد آتی ہے۔ چٹنی اور اچار لاکھ چٹخارے دار سہی مگر اس سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا اور نہ ہی سراب سے مسافر کی پیاس بجھائی جا سکتی ہے۔ بہرحال دنیا میں جہاں کہیں جو کچھ ہو رہا ہے میری اجازت کے بغیر ہو رہا ہے چنانچہ عطاء بھی جو کچھ گا رہا ہے۔ سُر میں یا بے سُر میں اسے گانے کی اجازت ہے کہ اپنے اپنے بوریئے پر جو گدا ہے شیر ہے اور عطاء سے نالاں اور اس کے گیتوں پر اعتراض کرنے والوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ عطاء کو گانے دیں..... بلکہ اعتراضات کے ڈھیلے مارنے والوں کو یہ جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں سب کی ہنسی ایک جیسی نہیں ہوتی۔

ہنسنے کا اپنا اپنا طریقہ ہے۔ فالسٹاف ہنستا ہے تو روم روم مسکرا اٹھتا ہے۔ شیر خوار بچے کلکاریاں مارتے ہیں تو ہمک ہمک کر ماں کی گود میں جا بیٹھتے ہیں۔ ادھر مونالیزا ہے صدیوں سے مسکرائے چلی جا رہی ہے اور اس سے آگے ایک مسکراہٹ وہ ہے جوان کے بعد گوتم بدھ کے لبوں کو ہلکا خمیدہ کر کے اس کی نظر میں جُگا دیتی ہے۔ میری دعا ہے عطاء اگلی منزل پر قدم رکھے۔

عجیب درد ملے گا مری کہانی میں

فاروق روکھڑی

عطاء اللہ خان کے فن اور شخصیت پر لکھنا یا کتابی شکل میں ڈھالنا تو میانوالی کے ادیبوں کا فریضہ تھا لیکن اس کام کا بیڑا جناب افضال شاہد صاحب نے اپنے ذمہ لے لیا۔ میں انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ عطاء اللہ خان نے جب ہوش سنبھالا تو وقت کے بے نیاز لمحوں نے اسے غم کے سوا کچھ نہیں دیا۔ اس غم کو سمیٹنے کے لئے اس موسیقی کا سہارا لیا۔ چوٹ پر چوٹ کھاتا رہا۔ اور یہ اپنی دھن میں باوجود گھر والوں کی مخالفت کے، اپنے پٹھان قبیلہ کے طنز سے بے نیاز ہو کر آواز کو کندن بناتا رہا۔

ہم قتیلؔ اپنی دُھن میں نہ کچھ سُن سکے
روکتے رہ گئے ہم کو دیر و حرم

میری پہلی ملاقات ان سے ماڑی انڈس کے مشاعرہ میں ہوئی۔ اُس وقت موصوف ہمہ گیر شہرت کے مالک نہیں تھے بلکہ بقول انور الحق ظہوری یہاں کے لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔

میری آواز کی لہریں سمیٹو
دھماکہ ہوں بکھرتا جا رہا ہوں

بہر حال اس وقت بھی موصوف کا نام میانوالی کے گلوکاروں میں سہر فہرست تھا۔ آہستہ آہستہ اُس وقت اس کے گیت بالخصوص دوہڑے اور ماہیے کیسٹ پر منتقل ہونے لگے تھے۔ چونکہ آواز میں سوز و گداز تھا۔ ماں بولی زبان کی دھڑکنیں تھیں اور درد بھری آواز میں مٹھاس کی عجیب کیفیت تھی اور بقول جناب احمد فرازؔ

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

اس طرح اس دکھی بھری آواز کی گونج گلگت سے لے کر کراچی تک پھیل گئی۔ حتیٰ کہ جہاں جہاں اور جس پَرائے دیس میں ہمارے پاکستانی رہائش پذیر تھے انہوں نے اِس آواز کو پسند کیا اور موصوف کے گیت تمام دنیا میں پھیل گئے۔ اس طرح انہوں نے نہ صرف ماں ولی کا قرض چُکا دیا بلکہ اس زبان کا بھرپور تعارف کرا دیا۔ اس وقت سرائیکی اور ہندکو ادب اور شاعری پر جتنا زور و شور سے کام ہو رہا ہے اس کا کریڈٹ بھی خان موصوف کو جاتا ہے۔ عطاء اللہ خان کبھی سارے گا..... ما..... پا.....دھا.....نی سا..... کے چکر میں نہیں پڑا بلکہ

وہ خود برملا کہتا ہے کہ مجھے فن موسیقی سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے علاقہ میں دوہڑہ ایک ایسی صنف ہے جس پر قدیم عرصہ سے کام ہوتا چلا آ رہا ہے اور یہاں کے ہر سرائیکی شاعر نے دوہڑے لکھے ہیں لیکن اس کی ادائیگی کا حق ہر گلوکار کے بس کا روگ نہیں تو اس ضمن میں میرا دعویٰ ہے کہ موصوف کا ہی نام لیا جا سکتا ہے جس نے اس صنف سخن کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے وہ گیت اور ٹپے جو برسہا برس سے شادی بیاہ کے مواقع پر الاپے جاتے تھے۔ اُن کی دھنیں پہلے ہی سے کمپوز شدہ تھیں ان تمام کو کیسٹوں میں محفوظ کرنے کا فریضہ اس انداز سے سرانجام دیا کہ انہیں چار چاند لگا دیئے۔ بقول مرزا امجد بیگ ؎

چاہیے اشکوں میں ہو خوں کی آمیزش بھی
تا کہ ہر اشک ترا لعل و گہر ہو جائے

عطاء اللہ کا فن موسیقی اس کا کرب، آنسو، درد اور آہیں ہیں جو کہ اُسے میانوالی میں سوغات کی صورت میں اور وہی درد اب زمانے کو واپس اپنی دُکھ بھری آواز میں لوٹا رہا ہے اور یہی دُکھوں کی آمیزش اس کی شخصیت کو نکھار رہی ہے۔ پہلی ملاقات سے لے کر آج تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے جس طرح پہلے وہ احترام کرتا تھا اسی طرح آج بھی۔ وہی انکساری، اسی پیار خلوص اور محبت سے ہر آشنا اور اجنبی سے ملتا ہے جس طرح پہلے ملا کرتا تھا۔ یہاں ایک مقولہ میں نے بزرگوں سے سنا تھا کہ جب کوئی آدمی امیر ہو جاتا ہے تو وہ برادری کو چھوڑ دیتا ہے اور جب کوئی آدمی برادری میں غریب ہو جاتا ہے تو برادری اسے چھوڑ دیتی ہے۔ یہ مقولہ کسی حد تک درست بھی ہے لیکن خدا شاہد ہے جہاں تک میں نے دیکھ ہے نہ تو اس نے برادری کو چھوڑا ہے نہ عیسیٰ خیل سے اس کی محبت کم ہوئی ہے بلکہ پہلے تو لوگ کہتے تھے کہ عیسیٰ خیل اتنا یہاں کے نوابوں سے مشہور نہیں ہوا جتنا تلوک چند محروم کی وجہ سے ہوا۔ اب میں یہ بات یقین سے کہہ رہا ہوں کہ اب عیسیٰ خیل کو جتنی شہرت عطاء اللہ خان سے ملی ہے وہ بیان و تحریر سے باہر ہے۔ لوگوں کا خیال ہے موصوف مغرور ہو گیا ہے۔ میں ہرگز اتفاق نہیں کرتا۔ اگر مغرور ہوتا تو اللہ تعالیٰ موصوف کو اتنا بڑا مقام عطا نہ کرتا۔ یہی انکساری، سادگی اور مروّت و محبت ہی تو ہے جو اس کی شخصیت کو جِلا بخش رہی ہے۔ آخر میں اپنے دو دعائیہ سرائیکی اشعار پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

میں شاعر فاروق نمانا
پیش کراں میں کے نذرانہ
گیت میڈے سب تیڈے نانویں
ہَسدا راہویں، وسدا راہویں

جہدِ مسلسل کی ایک داستاں

ڈاکٹر اسد فیض

لوک گیت تہذیب وثقافت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ان میں جذبوں کی مہک اور دھرتی کی بُو باس رچی ہوتی ہے۔ایک خاص خطے یا علاقے کے لوک گیت اُس کی تاریخ وتمدن کی کہانی بیان کرتے ہیں۔یہ لوک گیت جو کہ کسی قوم کا قیمتی سرمایہ، ورثہ اور پہچان ہوتے ہیں۔کتابوں میں دستیاب نہیں ہوتے بلکہ ان کا خزانہ میلے ٹھیلے اور گاؤں کے چوپال ہوتے ہیں۔ایک زمانے میں لوک گیت چوپالوں میں گائے جاتے تھے۔چاندنی راتوں میں سُریلی اور مدھر آواز میں گانے والا گائیک ایک عجیب سماں پیدا کر دیتا تھا اور لوگ جوق در جوق چوپال کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور سارا گاؤں بالاخر آواز اور گیتوں کی لَے پر وہاں جمع ہوتا۔لیکن اب گاؤں میں چوپال نہیں ہوتے سائنس کی ترقی کے ساتھ لوک گیت اب ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے ہوا کے دوش پر عوام تک پہنچتے ہیں۔لیکن یہ لوک گیت اب بھی اتنے ہی مقبول ہیں۔ان لوک گیتوں نے بہت سے گانے والوں کو بھی بے پناہ عزت اور شہرت بخشی ہے۔ابتدا میں طفیل نیازی، عالم لوہار اور ریشماں کی آواز کا طوطی بولتا تھا۔لوک گلوکاروں کی دوسری نسل میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے اپنی منفرد آواز انداز سے جو مقبولیت حاصل کی۔وہ اب تک کسی کے حصہ میں نہیں آئی ہے۔عطاء اللہ کی آواز میں بے پناہ درد وکرب ہے۔اس کے گیت بچھڑنے والوں کے غنائیے میں۔وہ جب گاتا ہے تو سننے والا اس کی آواز کے زیر وبم میں اپنے آپ کو گرفتار پاتا ہے اور جب تک عطاء اللہ گاتا رہتا ہے۔سننے والا اس کے سحر سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس کے گیت خواص وعام میں یکساں مقبول ہیں۔ عطاء اللہ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں سچائی کی خوشبو ہے یوں لگتا ہے کہ یہ محض لوک گیت ہی نہیں اس کی اپنی کہانی ہے۔وہ تلاش کے سفر میں ہے۔جیسے اس کا کوئی بچھڑا گیا ہو۔وہ اسے بستی بستی، نگر نگر ڈھونڈتا اور گاتا پھرتا ہے۔عطاء اللہ ایک گائیک ہی نہیں ایک خوبصورت فنکار بھی ہے۔وہ ایک عظیم قومی ورثہ ہے اس نے اپنی گائیکی سے نہ صرف پاکستانی کی شہرت کو پوری دنیا میں عام کیا ہے بلکہ اس نے ان عظیم لوک گیتوں کو جو ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے بلکہ اپنے خطہ کے گمنام شعراء کو بھی بین الاقوامی سطح پر متعارف کرایا ہے۔ اس حوالے سے لوک موسیقی اور گیتوں کے لئے اس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں میں نے اسے سرسوں کے پھول سے تشبیہ دی ہے یہ اداس رتوں کا پھول ہے جو ملنے اور بچھڑنے والوں کی یاد دلاتا ہے۔عطاء اللہ بھی ایسے ہی موسموں کا گائیک ہے۔اس لئے دونوں میں بے پناہ مماثلت ہے۔عطاء کی کہانی جہد مسلسل کی ایک داستاں ہے۔اس کی آواز میں بے پناہ قوت وصلاحیت پوشیدہ ہے۔یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی گائیکی ہے۔ایسے فنکار قدرت کا عطیہ ہوتے ہیں اور صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔عطاء اللہ کی صلاحیتوں اور گائیکی اس قابل ہے کہ پاکستان میں تحقیق اور لوک ورثہ کے ادارے اس پر تحقیق کام ترتیب دیں۔اس پر فلم بنائی جائے اور ہماری جامعات اس کی فن وشخصیت کے حوالے سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگڑی دیں۔اس کام سے پہلوتہی اور عدم دلچسپی ایک بڑا قومی نقصان ہوگا کہ آج مغربی ممالک ہمارے فنکاروں اور لوک گائیکی پر تحقیق کر رہے ہیں اور انہیں لیکچرز کے لئے مدعو کرتے ہیں لیکن خود ہمارا اپنا ملک اور لوگ اس سے بے خبر ہیں۔

مہدی حسن بمقابلہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی

عنایت حسین بھٹی

مہدی حسن بلاشبہ ایک بڑے گلوکار ہیں انہوں نے گایا بھی اچھا اور نام بھی بڑا پایا۔ ان کے فن میں کائی کلام نہیں لیکن بعض اوقات وہ عجیب وغریب بیان داغ دیتے ہیں مثلاً انہوں نے یہ کہا کہ میرے پاس راگوں کی کچھ ایسی بندشیں ہیں جو پوری دنیا میں اور کسی کے پاس نہیں۔ میں تو اپنے آپ کو ایک معمولی گلوکار بھی نہیں سمجھتا اور کلاسیکل سے اتنا آشنا نہیں لہٰذا مہدی صاحب کی کسی اونچی اور مشکل بندش کا تجزیہ میرے بس کا روگ نہیں۔ اس کا جواب شام چوراسی والے گھرانے کے سلامت علی خان پٹیالے والے گھرانے کے فتح علی خان، بڑے غلام علی خان کے ورثا یا پیارے خان کے ورثا ہی دے سکتے ہیں دوسری بات مہدی حسن نے کہی کہ بعض جاہل ملاں گانے کو حرام کہتے ہیں حالانکہ سُر تو قدرت کا خاص عطیہ ہیں۔ ان کی بچت ہوگئی کہ دور حاضر کے ملاں دھن سمیٹنے کی دھن میں اس قدر غرق ہیں کہ انہیں کچھ خبر نہیں کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں ورنہ مہدی صاحب پر فتوؤں کے اتنے گولے برستے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ یہ عجیب دودھ ہے جو مصیبت میں یاد آتا ہے۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے بھی کچھ ایسا ہی بیان دیا ہے الفاظ الگ الگ ہیں وگرنہ ایک ہی درد اور کسک ہے جو دونوں کے جگر کو کھائے جا رہی ہے۔ عطاء اللہ نے کہا ہے کہ پاکستان میں لوگ گانے والے کو میراثی کہتے ہیں اور یہاں موسیقی کو معیوب سمجھا جاتا ہے اور فنکار کے مقابلہ میں کھلاڑیوں کو بہت بلند مقام دیا جاتا ہے۔ انہوں نے بڑے پتے کی بات کہی ہے اور یہ حقیقت ہمارے مشاہدے میں بھی آچکی ہے۔ عطاء اللہ مقبولیت میں کسی سے کم نہیں اور انہوں نے کسی بیرونی ثقافت کو اپنے اوپر سوار نہیں ہونے دیا۔ سماعت کے الگ الگ زاویے ہیں۔ ان زاویوں کی بناء پر ہر شخص کا کوئی نہ کوئی پسندیدہ فنکار ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کوئی فنکار بھی بُرا نہیں کیونکہ سب کے اپنے اپنے سامعین ہیں۔ میرے اس عظیم جمہوریہ پاکستان میں تین فنکاروں نے صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن لڑے۔ کمال صاحب، قوی صاحب کی فنی خدمات کا تو معترف ہوں لیکن مجھے ان کی سماجی خدمات ک کوئی علم نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جب کبھی ہم نے قوی صاحب کو کسی مجبور اور ضرورت مند شخص کی مدد کے لئے آواز دی وہ فوراً آگے آئے۔ اپنی تعریف یا خدمات کا ذکر کرنا کوئی اچھی بات تو نہیں لیکن یہاں ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ عرض کروں جہاں تک میری سماجی خدمات کا ذکر ہے میں دعویٰ کے ساتھ عرض کرسکتا ہوں کہ پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو۔ جس نے مجھ سے زیادہ خدمات کی ہوں۔ قارئین کرام میری پوری زندگی ضرورت مندوں اور بیماروں کی خدمت میں گزر گئی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے لے کر آج تک میں نے جو کچھ کمایا ملک وقوم کی بقاء کے لئے خرچ کر دیا اور جس دُکھ اور درد کا اظہار مہدی صاحب اور عطاء اللہ نے کیا ہے وہ پاکستان کے تمام فنکاروں کا متفقہ درد ہے۔ فنکار کسے کہتے ہیں جو حساس ہو، دوسروں کے دُکھ کو اپنا سمجھے۔ خوددار ہو، خوشامدی نہ ہو، منکر نہ ہو، تو جناب ہم تینوں قوی صاحب، کمال صاحب اور بندہ ناجائز الیکشن لڑے۔ ان کا نشان لکڑی کا وہ ٹیڑھا ڈنڈا تھا جو جدید اسلحہ کے تعارف اور اس کے عام ہونے سے پہلے کھیل کے ساتھ ساتھ مخالفوں کی ٹانگیں توڑنے اور سر پھوڑنے کے لئے خطرناک

اور موثر اسلحہ سمجھا جاتا ہے تھا۔ موصوف یقیناً اپنے کھیل میں اعلیٰ تھے لیکن ہم نے یہ کہیں سے نہیں سنا کہ انہوں نے کوئی سماجی یا عوامی خدمت بھی سرانجام دی ہو۔ لیکن محترم قارئین وہ الیکشن میں جیت گئے اور وزیر بھی بن گئے۔ دوسرے ایک عظیم کھلاڑی ہیں انہوں نے عوام سے اپنی والدہ کے نام پر ہسپتال بنانے کے لئے چندہ مانگا۔ پریس نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ عوام نے ان کو اتنا دیا کہ انہوں نے اپنی والدہ کے نام پر ہسپتال بھی بنا لیا اور بقول سرفراز نواز صاحب کچھ بچ بھی گئے اور وزیراعظم بننے کے نعرے بھی لگ گئے۔ جبکہ میں نے اپنی گرہ سے گلاب دیوی ہسپتال میں اپنی والدہ کے نام پر ایک مکمل وارڈ تعمیر کروایا۔ جس میں کوئی چندہ شامل نہیں لیکن محض ایک فنکار ہونے کی سزا یہاں کے باشعور اور بلند ہمت عوام نے مجھے یہ دی کہ الیکشن میں غریبوں نے مجھے جی بھر کر لوٹا اور اوپر کے لوگوں نے تمام حربوں سے ناکام کیا یعنی مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے۔

میں مہدی صاحب اور عطاء اللہ سے عرض کروں گا کہ بھائیو لاہور کے ایک بہت معتبر عالم جو پیپلز پارٹی کو ووٹ دینے والے کو جہنمی ہونے کا فتویٰ صادر فرماتے تھے اور عورت کی حکمرانی کو شرعاً حرام اور ناجائز کہتے تھے۔ میں نے اپنی ان گنہگار آنکھوں کے ساتھ پیپلز پارٹی کے ایک بڑے وزیر کے کمرہ اقدس میں دیکھا۔ جہاں وہ ان کی حکومت اور کارناموں کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ ہم کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ پیدا ہونا تو کسی کے بس میں نہیں۔ میں نے مہدی صاحب نے، عطاء اللہ نے اپنی مرضی سے نہ تو ایسے گلے لگوائے اور نہ ہی یہاں پیدا ہوئے۔ یہ تو خالق جانے کہ ہمیں کس جرم کی سزا ملی یہ قدرت کی ستم ظریفی کہیے کہ اس نے ہمیں ایسا فن عطا کیا جو ہمارے علم و فضل، ہماری دانش، ہماری سیاسی سوجھ بوجھ اور تمام سماجی اور علمی خدمات کو نگل گیا۔ یہاں ملاؤں کی حکومت ہے، کھلاڑیوں کا مقام ہے جو عوام کی کوئی خدمت نہ بھی کریں اور ان کی تعلیم کیسی ہی ہو لیکن بینکوں، ریلوین، پی آئی اے میں ان کے لئے اعلیٰ ملازمتیں ہیں نہ مولانا بننا ہمارے بس میں ہے نہ کھلاڑی بننا ہماری قدرت میں ہے۔ عطاء اللہ میں ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ اتنا مقبول ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیشہ اپنے گانے کی نفی کی ہے اور اپنی کامیابی کو اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور بزرگوں کی دعاؤں کا ثمر کہا ہے لیکن اس کے باوجود ''گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے۔'' ایک واقعہ پر بات ختم کرتا ہوں۔ فلم تان سین میں سہگل تان سین اور خورشید تانی کا کردار ادا کر رہی تھی۔ تانی نے گایا تو نفیس مزاج پرندے اور چوپائے اس کی طرف سمٹ آئے، پھر ایک ہاتھی پاگل ہو گیا۔ تان سین سامنے آ کر گانے لگا۔ ہاتھی رام ہو گیا اور بیٹھ گیا۔ تان سین نے فخریہ تانی کی طرف دیکھا تو تانی نے فوراً کہا کہ ہاں ایک موٹے دماغ کا جانور آپ کے فن سے مسحور ہو گیا۔ اس شعر پہ اپنا کالم تمام کرتا ہوں۔

بس اساڈا وَس نہ کوئی ، کیہ تُساڈا کھونا
ماڑے ادا کیہ زور محمدؔ ، نس جانا یا رونا

موسیقی کا گل لالہ

محمد محمود احمد

گلِ لالہ کے متعلق میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ فطرت خود بخود اس کی حنا بندی کرتی ہے۔ البتہ اپنے لالہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو اُس وقت سے جانتا جب میں نرسری میں تھا اور آج کے اس قد آور درخت کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس عظیم فنکار کو قریب سے جاننے والے لالہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ بے شک فطرت نے اس لالہ کو اُس لالہ سے زیادہ عمر، حسن، تازگی، نکھار، شگفتگی اور خوشبو عطا کی ہے۔

جب میں نے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ پر درج ہونے کی خبر سنی کہ دنیا میں سب سے زیادہ کیسٹ اسی لاجواب فنکار کے تواتر سے ریلیز ہوئے ہیں تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ میں دنیا کے لاکھوں ایسے دلوں سے باخبر ہوں جن پر ''عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی'' رقم ہے اور شاید یہ اعزاز سے بڑا ہے۔ لوگ عطاء کی فنی زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ عطاء اللہ ہر طبقے کی روزمرہ ضرورت ہے مگر شخصی حوالے سے بہت زیادہ لوگ بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ عطاء کا ماضی حسرتوں، مایوسیوں، ناکامیوں اور آنسوؤں سے لبریز ہے۔ مگر اس نے ان دگرگوں حالات کا اس قدر باوقار انداز سے استقبال کیا کہ آج دنیا کا ہر آرام اور سکون اس پر نثار ہے۔ سوائے ایک خلاء کے، جسے میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ پورا بھی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اگر وہ خلاء پورا ہو گیا تو یہ کرب، درد، یہ آہیں، یہ سسکیاں، یہ سُر، یہ ساز، یہ تڑپ ختم ہو کر رہ جائے گی اور عطاء اللہ میانوالی کے ایک عام پٹھان کی طرح ہو کر رہ جائے گا۔ میرے خیال میں ایک فنکار آخر کسی دن قدرت کی شفیق سایہ دار منزل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ میں پچھلے کچھ برسوں سے عطاء اللہ کے اندر بے پناہ روحانی تبدیلیاں محسوس کر رہا ہوں اور آج یہ واضح ہو گیا ہے کہ موسیقی کے اس گل لالہ دریا میں کئی آباد جزیروں کا سراغ لگا لیا ہے۔ مجھے عطاء کے مذہبی تجسّس کا ادراک اُس وقت ہوا جب اس نے اپنی بیٹی کا نام لاریب تجویز کیا۔ بڑے بیٹے کا نام سانول عطا کی ثقافت اور دوسرے فرزند بلاول کا نام اس کی روایت پسندی کا بین ثبوت ہے۔ عطاء اپنی رہائش گاہوں کے ڈیزائن خود بناتا ہے۔ کمروں کی آرائش بھی اسی کے احساس جمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مصری دانشور نجیب محفوظ اصل خوبصورتی کا مقام چمڑے کے اندر متعین کرتا ہے۔ عطاء مصور بھی ہے، خطاط بھی خوبصورت باتیں کرنے والا بھی اور پُر درد آواز کا مالک بھی۔ حسن انتہا پر پہنچنے کے بعد درد میں تبدیل ہو جاتا ہے جیسے یوسف کو عزیز مصر کے جیل خانے میں جانا پڑا۔ پچھلے دنوں ملک کے ایک معروف قاری نے مجھے بتایا کہ میں نے عطاء اللہ خان کی آواز میں ایک ایسا اصف دیکھا ہے جو قدرت نے اور کسی فنکار کو اس قدر صحت مند شکل میں عطا نہیں کیا اور وہ ہے الفاظ کی موزوں ترین ادائیگی کا وصف ہے۔ قرات میں کچھ ''حروف حلقی'' ہوتے ہیں جن کی ادائیگی حلق کے مختلف حصوں سے کی جاتی ہے مثلاً ک اور گ وغیرہ۔ عطاء ایسے الفاظ کی ادائیگی بڑے بھرپور طریقے سے کر سکتا ہے۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی اگرچہ موسیقی کے حوالے سے آج بھی دامن میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتا مگر میں اسے موصوف کی کسر نفسی قرار دوں گا۔ بڑے بڑے مُہان فنکار تسلیم کرتے ہیں کہ عطاء موسیقی کے

ہر میدان کا شہسوار ہے۔ فنکار بذات خود قدرت پیدا کرتی ہے اور وہی اسے جاوداں بناتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک سرائیکی زبان کا وجود قائم اور ثقافت کی عمر دائم رہے گی، عطاء وقت کے سینے میں دھڑکتا رہے گا۔ اپریل ۱۹۷۳ء کی وہ سرد سہ پہر مجھے آج بھی یاد ہے جب گورنمنٹ مڈل سکول عیسیٰ خیل سے میں کلاس اول میں پہلا دن گزار کر ابا جی کے ساتھ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کے الصدف جنرل سٹور سے ہوتے ہوئے گھر گیا تھا۔ اس کچی عمر میں کسی گلوکار سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اچھی یادداشت میرا موروثی وصف ہے۔ بوسکی کی قمیض اور سفید شلوار میں ملبوس، گہرے سبز گلاسز والی عینک لگائے لمبے لمبے بالوں والا عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کا وہ حلیہ مجھے بخوبی یاد ہے۔ ابا جی نے کہا۔ ''عطاء اللہ! محمود بہت اچھا گاتا ہے اسے ہارمونیم سکھاؤ۔ عیسیٰ خیلوی نے بڑے نرم اور میٹھے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ ''ہاں بھئی محمود صاحب! کیا آپ گاتے ہیں؟ میں نے بھی کہہ دیا۔ جی ہاں۔ میں نے انتہائی بونگے، بے سُرے اور بے ڈھنگے انداز سے انہی کا کسی بیٹھک پروگرام میں گایا ہوا ماہیا سنا دیا۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے مجھے بڑی داد دی اور ''نذر'' کے طور پر دو ڈیکو ٹافیاں پیش کیں۔ پھر کہا محمود بھئی! تم بی اے کر لو۔ میں تمہیں موسیقی سکھاؤں گا۔ دوسرے دن میں نے اپنے ہم جماعتوں کو مطلع کیا کہ میں عنقریب بی اے کرنے کے بعد عطاء اللہ کی شاگردی اختیار کر کے بہت مشہور گلوکار بننے والا ہوں۔ ہم میں سے کسی کو بھی پتہ نہ تھا کہ بی اے اگر ہوا تو چودہ برس بعد ہوگا۔ کچھ روز بعد میرے کلاس ٹیچر محمد صادق نے بتایا کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی اور میں تمہارے ابا جی سے گورنمنٹ ہائی سکول عیسیٰ خیل میں ساتویں سے دسویں تک پڑھتے رہے ہیں۔ چند ماہ بعد ہم سب گھر والے کندیاں آئے جہاں میرے پھوپھی زاد بھائی مقبول احمد ہاشمی کی شادی ہو رہی تھی۔ کیا دیکھا کہ دوسری رات جب میرے چچا کیپٹن دوست محمد ہاشمی کی کشادہ حویلی میں مٹی کے ایک چبوترے پر بچھی رنگین دریوں پر مختصر سے سازندوں کی سنگت میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی گا رہے تھے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ عیسیٰ خیلوی میرے ایک چچازاد بھائی ٹھیکے دار فاروق قریشی کے گہرے دوست ہیں اور دونوں نے ''الصدف اینڈ کو'' کے نام سے ایک تجارتی سلسلہ بھی جاری کر رکھا ہے۔ یہ لوگ سو میل سے زائد طویل دریائے سندھ کے ساحلی علاقے سے گتہ اور کاغذ کی فیکٹریوں کو خام مال سپلائی کرتے تھے۔ ۱۹۷۹ء تک ہمارے ملنے ملانے کا سلسلہ قائم رہا وہ کبھی کبھار میری تختی چیک کر کے خوشخطی کی اصلاح دیا کرتے تھے۔ عیسیٰ خیلوی نے ۱۹۸۹ء میں بلوٹ شریف میں شاہ عیسیٰ کے دربار پر جب پہلی بار میرا کلام گایا اتفاق سے اسی دن میں نے بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی۔ مجھے پچھلے برسوں میں ان سے سینکڑوں بار ملنے کا موقع ملا ہے میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ خداوند عالم سب کو ان جیسے لوگوں کی صحبت نصیب کرے۔ انہوں نے سینکڑوں لوگوں کو برسر روزگیا، گھر سے دور ہزاروں ملازمین کے تبادلے کرائے، منشیات کے عادی افراد کا علاج کروایا، مساجد کے لئے جی بھر کر پیسے دیئے۔ ناداروں کو دل کھول کر لیکن خاموشی سے امداد دی۔ ممکن ہوا تو دوستوں اور جاننے والوں کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہوا۔ میں نے کبھی عطاء اللہ کو غصے میں اپنی اہمیت جتلاتے ہوئے یا کسی کی غیبت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ خوش، مطمئن، صابر اور عاجز، اپنی تعریف و تضحیک دونوں کا نوٹس نہیں لیتے۔ انسان دوستی اس قدر کہ وہی بچپن کے یار، وہی پرانے شاعر اور وہی محفلیں بدستور قائم ہیں۔ اولیائے کرام سے عقیدت اتنی ہے کہ اپنی روح کو شاہ سلیمان تونسوی کے مزار کی مہک سے معطر رکھتے ہیں۔ بہت نفاست پسند ہیں۔ دور اندیش اتنے کہ چالیس کنارز مین پر پتھر کی حویلی بنائی ہے

تا کہ چھ سات سو برس تک با آسانی قائم رہ سکے۔ ہر لائق آدمی کی دل کی تمام گہرائیوں اور سچائیوں سے قدر کرتے ہیں۔عیسیٰ خیلوی کو محبت نہیں ملی اس لئے وہ ہر جگہ محبت بانٹتے ہیں، خلوص دیتے ہیں، وفا کرتے ہیں۔کسی نے انہیں بے رحمی سے بھلا دیا۔اس لئے وہ سب کو یاد رکھتے ہیں۔معروف سکالر ڈاکٹر پریشان خٹک سے میں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ایک بار جب ایڈریس مانگا تو انہوں نے مجھے کہا بیٹا! پشاور میں ایک ہی ''پریشان'' ہے۔عیسیٰ خیل میں ایک ہی تو عیسیٰ خیلوی ہے جس نے اپنے شہر کو وہ شہرت دی جو پاکستان اور ہندوستان میں کوئی شخص اپنے شہر کو نہ دے سکا۔

دل کے تار ہلا دیتا ہے

(آنجہانی ہرچرن چاولہ کا ایک خط، معروف بھارتی فلمساز و ہدایت کار راج کپور کے نام)

برادر محترم راج جی! نمستے!

آپ کے خط کا جواب اب مجھے دے ہی دینا چاہیے۔ایک ضرورت پیش نہ آجاتی تو اتنی جلدی آپ کو دوبارہ ڈسٹرب نہ کرتا۔ لکھنا لکھانا تو میرا شغل ہے مگر آپ کو اتنی فرصت کہاں کہ مجھ سے باقاعدہ خط و کتابت کر سکیں۔ ویسے آپ تو ہم سب تک پہنچتے ہی رہتے ہیں اپنی فلموں کے ذریعے۔ وہ جو آپ اپنی کٹیا میں بیٹھے پہروں ایک خیال کے ساتھ راس رچاتے ہیں۔آپ کی وہ راس بھلا آپ تک محدود ہو کر تو نہیں رہ جاتی۔عام تک بھی تو پہنچتی ہے۔آپ کا کمال یہ ہے کہ اپنے دُکھ اپنے تک رکھ کر سکھ اور خوشیاں دوسروں کو بانٹتے رہتے ہیں (فلم ''آہ'' میں نئے شادی شدہ جوڑے کو آپ کی دعائیں.....اور ''میرا نام جوکر'' میں دُکھی جوکر کا لوگوں کو ہنساتے پھرنا) میرے جیسے جو آپ کے اس بھید کو پا گئے ہیں کیا پل پل یہ دعائیں نہیں کرتے ہوں گے کہ بھگوان آپ کو سارے جہان کی خوشیاں عطا کرے۔میرے پیارے جوکر، میری اس دعا میں میری تھوڑی خود غرضی بس اتنی سی شامل ہے کہ جب آپ اپنے دکھوں اور پریشانیوں میں بھی دوسروں کو خوشیاں بانٹ سکتے ہیں تو سکھوں میں لوگوں کو کتنی جنتیں بخشیں گے۔لوگوں اور خود اپنے لئے ان جنتوں کے لالچ میں آپ کی صحت اور خوشی کے لئے بھگوان سے پراتھنا کیا کرتا ہوں۔آپ نے خط کے نیچے جو ''بولے سونہال، سَت سری اکال'' لکھا ہے۔ تو بھئی عرض ہے کہ میں پیدا ہندو کے گھر ہُوا ہوں۔پلا بڑھا اُس انسان کی گود میں ہوں جس کے سامنے زیادہ وقت گرنتھ صاحب اور زبان پر گوربانی رہتی ہے۔علم کی دولت ایک مسلمان سے حاصل کی ہے۔کرسچن لکشمی (فارن کرنسی) سے دنیا کے ہر سُکھ دیکھے ہیں تو بولو میں کس دھرم کو کم محبت دوں اور کیوں؟ مجھے یہاں اور بات کرنی تھی اور میں کہاں پہنچ گیا۔کیا آپ کو ان سب باتوں کا مجھ سے کم علم ہوگا۔ پھر میں کیوں بڑا گیانی دھیانی بنا بڑے بڑے بھاشن جھاڑ رہا ہوں۔راج بھائی! میں نے اپنے پہلے خط میں لکھا تھا کہ مجھے آپ سے کسی کی سفارش نہیں کرنی ہے۔اس وقت وہ بات سو فیصد سچ بھی تھی مگر اب بات دوسری ہے۔مجھے کیا پتہ کہ یہ شخص جو اچانک، بناں میرے علم کے میرے شہر اوسلو (ناروے) میں گانے کی محفلیں سجانے آرہا ہے۔میرا ہم وطن نکلے گا اور ایسی زبان میں گانے گائے گا۔جس کا میں بچپن سے عاشق رہا ہوں۔(آپ کے والد محترم بھی تو پشاور کی گلیوں کے ذرّے ذرّے سے پیار کرتے تھے) جس کے ایک ایک گانے

پر لوگ ہزاروں روپے لُٹا دیتے ہیں۔ میری ذرا سی درخواست پر میرے گھر ''بدر کا ساگ'' کھانے بھی پہنچ جائے گا اور نہ صرف مفت گانے سنا جائے گا بلکہ اپنے ہاتھوں سے ریکارڈ کر کے بھی دے جائے گا۔ میں ہر قسم کے ذہنی بوجھ سے آزاد ہوں کیونکہ میں کسی کی سفارش نہیں کر رہا ہوں میں تو محض ضرورت مندوں کو ایک دوسرے سے ملا رہا ہوں۔ ضرورت مند آپ اس طرح ہیں کہ آپ ایک فلم ''حنا'' پاکستان میں جا کر بنانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے آپ کو وہاں کے بہت اچھے ایسے گائیک کی بھی ضرورت ہوگی جو وہاں کے لوک گیتوں کے گانے میں ایک خاص مقام رکھتا ہو۔ اس سلسلے میں عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کی آواز میں بھگوان نے ایسا جادو بھرا ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں مکیش بھی لگتے ہیں اور رفیع بھی محسوس ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ان کی اپنی پیاری اور میٹھی آواز کا آہنگ اور انداز جُدا ہے..... وہ اردو کی نظمیں، گیت اور غزلیں وغیرہ بھی کمال فن سے گاتے ہیں۔ انہوں نے آج تک کسی بھی فلم کا گانا نہیں گایا اور نہ ہی گانا چاہتے ہیں مگر آپ کے لئے وہ ہزار دل و جان سے گانے پر رضامند ہیں۔ ان کا مہندی (حنا) پر گانا تو سارے پاکستان اور پنجابی سمجھنے والوں کے دل کے تار ہلا دیتا ہے۔ اب ان کی آواز انڈیا کے ساتھ ساتھ فارن میں بھی گونجنے لگی ہے۔ میں ان کا پتہ نیچے لکھ رہا ہوں۔ آپ ایک بار انہیں سن لیں گے تو ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے اپنا اور بھی زیادہ مخلص اور قریبی دوست محسوس کرنے لگیں..... بھگوان کرے میری یہ کاوش دو ضرورت مند دلوں کے بیچ پل بن جائے۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ باقی باتیں پھر سہی۔

آپ کا بیٹا

ہرچرن چاولہ

ہماری ہم راز، ایک محبت بھری آواز

توفیق بٹ

ہمارے ہاں آواز دبانے کا رواج عام ہے مگر بعض آوازیں ہم چاہیں بھی تو نہیں دبا سکتے۔ یہ آوازیں ہمیں اپنے اردگرد رقص کرتی سنائی دیتی ہیں، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز بھی ایک ایسی ہی آواز ہے۔ میانوالی سے گونجنے والی یہ آواز اب دنیا میں ہر کہیں سنائی دیتی ہیں۔ اس آواز نے اپنے ملک میں اپنے شہر کا اور پھر دنیا میں اپنے ملک کا نام روشن کیا۔ امریکہ تک پاکستان کے شہر میانوالی کو صرف اس لیے پہچانا جاتا ہے کہ یہ عطاء اللہ نیازی کا شہر ہے۔ عمران خان کے حوالے سے بھی میانوالی کو نیک نامی ملی۔ عطاء اللہ نیازی اور ڈاکٹر اجمل نیازی کے حوالے سے لیکن جو میانوالی کو نیک نامی نصیب ہوئی وہ روشن بھی ہے اور مستقل بھی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کے تحریر کردہ لفظوں کی بادشاہت اور عطاء اللہ نیازی کے گلے سے نکلنے والی آواز کی شہنشاہیت نے ادبی و ثقافتی دنیا میں میانوالی کو عالمی حکمران بنا دیا ہے۔ عطاء اللہ نیازی کہتا ہے مجھے گانا نہیں آتا یہ اس کی عاجزی ہے ورنہ اب تو آدھا پاکستان گلوکار ہونے کا دعویدار ہے۔ ایک قابلِ افسوس بات یہ

ہے کہ ہمارے ہاں فنکاروں اور گلوکاروں کو پہچانا تو جاتا ہے، مگر ان کی عزت نہیں کی جاتی حالانکہ فنکاروں کا کردار معاشرے کے ان کرداروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے کہ جو کردار معاشرے کی تباہی اور بربادی کا باعث بن رہے ہیں، مگر اس ساری صورت حال کے باوجود فن کی دنیا میں بعض شخصیات ایسی ہیں کہ جن کا لوگ دل سے احترام کرتے ہیں۔ عطاء اللہ نیازی بھی ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہے کہ جن کے چاہنے والوں کی تعداد آسمان کے ستاروں سے کسی طور کم نہیں مرحوم دلدار پرویز بھٹی نے کہا تھا کہ عطاء اللہ نیازی جیسے لوگوں سے محبت کرنا ہمارا قومی فرض ہے۔ قومی فرض ادا کرنا دلدار پرویز بھٹی سے زیادہ کون جانتا تھا۔ اس نے اپنی جان بھی اسی قسم کا فرض ادا کرتے ہوئے دے دی۔ دلدار بھٹی کی پہلی برسی پر لوگ عطاء اللہ نیازی اور اجمل نیازی سے پوچھ رہے تھے کہ ان کے قبیلے کا ایک فرد عمران خان لاہور میں ہونے کے باوجود اپنے محسن دلدار بھٹی کی برسی میں کیوں شریک نہیں ہوا۔ اجمل نیازی اور عطاء اللہ نیازی کے پاس اب عمران خان نیازی کی صفائی پیش کرنے کے لئے کوئی لفظ باقی نہیں بچا چنانچہ اس موقع پر ان کی خاموشی بڑے واضح انداز میں لوگوں کے اس دکھ میں شریک نظر آئی۔ عطاء اللہ نیازی چونکہ دوستی نبھانا اور محبت کے تمام تر تقاضوں کو پورا کرنا جانتا ہے چنانچہ وہ علالت کے باوجود دلدار کی برسی میں شریک ہوا۔ پچھلے سال عطاء اللہ نے دلدار شو کے سلسلے میں میری جو مدد کی اس پر اس کی انسان دوستی اور دلدار دوستی پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے تعاون سے ہم نے سات لاکھ روپے اکٹھے کئے۔ دلدار شو کے سلسلہ میں مجھے برادرم سہیل احمد، ذوالفقار چیمہ اور ایک عزیز دوست سخی سرور بٹ کی محبتیں بھی ہمیشہ یاد رہیں گی۔ عطاء اللہ نیازی جانتا ہے کہ لوگوں کے دکھوں کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے چنانچہ اس سلسلے میں وہ اپنا بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ حالانکہ لوگوں کے دکھ کم کرتے کرتے اس کے اپنے دکھ بہت بڑھ چکے ہیں مگر وہ اپنے لئے نہیں ہمارے لئے جیتا ہے وہ گاتا بھی ہمارے لئے ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے وہ جیتا رہے اور گاتا رہے۔ عطاء اللہ نیازی اپنی آواز کے حوالے سے ہی نہیں اپنے انداز کے حوالے سے بھی ہمارے لئے قابل احترام ہے۔ وہ ملکی ثقافت کا ایک عمدہ نشان ہے۔ محبت اور شرافت کا یہ پیکر کوئل کی زبان میں بولتا ہے اور ہمارے کانوں میں رس گھولتا ہے۔ خدا کرے ہمارے کانوں میں ہمیشہ اس کی آواز گونجتی رہے کیونکہ اس آواز کو سننے کی اب ایسی عادت پڑ چکی ہے کہ کوئی اور آواز اچھی ہی نہیں لگتی۔ عطاء اللہ نیازی کی آواز جب دُکھی دلوں کی آواز میں ملتی ہے تو ایک نیا جہان متعارف ہوتا ہے۔ ایک ایسا جہان کہ جو مفاد پرستی، لالچ، نفرت، ہوس اور خوف کی دنیا سے پاک ہے۔ اس جہان میں ہمیں صرف محبت ہی محبت دکھائی دیتی ہے۔ محبت بھری عطاء اللہ کی یہ آواز اب ہماری ہمراز بن چکی ہے اور آواز جب ہمراز بنتی ہے تو بڑے بڑے راز کھلتے ہیں۔ اس طرح ایک راز ہم پہ کھلا کہ عطاء اللہ ایک ایسا انسان ہے کہ اس جیسے انسان یہاں کچھ اور ہوتے تو ایک خوبصورت گلشن سجایا جا سکتا تھا وہ ایسا انسان ہے کہ اس جیسے انسان یہاں کچھ اور ہوتے تو ایک خوبصورت گلشن سجایا جا سکتا تھا وہ اس وقت ہمارے وطن عزیز کا عزیز ترین اور مقبول ترین گلوکار سمجھا جاتا ہے۔ وہ ہمارے ملک کا سرمایہ ہے اور ہمیں اپنے اس سرمایہ کی قدر اور حفاظت کرنی چاہیے۔

درد کا پیمبر

محمد افضل عاجزؔ

ساغرؔ نے کہا تھا۔

فقیہہ شہر نے تہمت لگائی ساغرؔ پر
یہ شخص درد کی دولت کو عام کرتا ہے

یہاں اگر ساغرؔ فقیہہ شہر کی جگہ ''تمام دہر'' باندھ دیتا تو یہ شعر عطاء کی دکھ نواز شخصیت کے ترنم آمیز آفرین پہلو پر مکمل طور پر پورا اترتا۔ عطاء کی آواز میں دکھ درد کی ایک بستی آباد ہے جس کے تمام گلی کوچوں میں سسکیوں، سسکاریوں کی ترسیل جاری ہے۔ اور جس میں رہنے والے آنسوؤں اور آہوں کی کراہوں میں انجانی لذتیں بکھری ہوئی ہیں۔ منصور آفاق کی یہ بات میرے اس خیال کی تصدیق کرتی ہے۔ عطاء اللہ اتنی میٹھی سسکاری ہے۔ جس پر لاکھوں گھٹی گھٹی کراہوں کو پیار آجاتا ہے۔ عطاء اللہ فنکار نہ سہی وہ فن نا آشنا سہی لیکن پھر بھی وہ بھی وہ بہت بڑا بلکہ اس عہد کا سب سے بڑا فنکار ہے۔ فن کا مقصد عوام کی اکثریت کو مسرت سے ہمکنار کرنا ہوتا ہے اور عطاء سے زیادہ مقبول کوئی نہیں یعنی عطاء سے بڑا فنکار کوئی نہیں۔ وہ جب لب کھولتا ہے تو چیختے احساسات کی کرب زدہ گہرائیوں سے سوز و گداز کے آفتاب پھوٹتے ہیں اور اہلِ درد پر اس کی کرنیں نمک کا سا کام دیتی ہیں۔

اُس کی آواز نمک ہے میرے زخموں کے لئے
ہائے ساجدؔ سے میری کیسے شناسائی ہے

میں نے عطاء کو جب پہلی بار سنا تو مجھے محسوس ہوا تھا جیسے درد کی لہریں بے سمت ہو کر بکھر رہی ہیں۔ یہ اس دور کی بات ہے جب عطاء نے نیا نیا گانا شروع کیا تھا اور پھر تھوڑے ہی عرصے میں عطا نے اس درد کو اپنی گرفت میں لے کر وہ زبان عطا کی کہ بے زبانوں کے دلوں کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ عطاء فن کے جس مقام تک جا پہنچا ہے اس کی بلندی تشبیہوں اور استعاروں سے ماورا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ارتقاء جب انتہا کو پہنچتا ہے تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ عطاء نے لوک فن کو انتہا تک پہنچایا ہے تو اب اسے کیا کرنا چاہیے قدرت عطاء جیسے لوگوں کو بے پناہ صلاحیتیں عطا کرتی ہے۔ ارتقاء کو انتہا تک لے جانے والے اور نجانے کتنے کاموں میں زندگی کی دلیل بن سکتے ہیں۔ عطاء اب لوک فنکاروں میں ایک چراغ کی طرح چمک رہا ہے لوگ پروانوں کی طرح اس پر گرتے ہیں اور فنا بھی ہو جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چراغ اس وقت تک صدائے ساز کی نیرنگیوں میں جلتا رہے گا۔ جب تک لوک موسیقی زندہ رہے گی۔ عطاء کو مٹانا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ خدا نے اس کو اعتماد ذات کے کسی غیر فانی لمحہ میں تخلیق کیا ہے۔

لوک موسیقی کا مُہان کلاکار

مظہر نیازی

یوں تو اس جدید دور بہت آوازیں سننے کو ایسی ملتی ہیں لیکن ان میں سے ایک آواز ایسی بھی ہے جو سب سے منفرد ہے۔ یہ خوبصورت آواز اور خوبصورت انداز آپ کو موسیقی کی تاریخ میں کہیں نہیں ملے گا۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے اپنے خونِ جگر میں انگلیاں ڈبو کر اپنے گلے میں سوز و گداز پیدا کیا ہے۔ جو دلوں کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتا ہے اور دکھی دلوں کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔ عطاء اللہ خان جب ہارمونیم پر اپنی انگلیاں پھیرتا ہے تو کومل کومل سُروں سے ایسے ایسے درد اور سوز بھرے گیت پھوٹتے ہیں جو سننے والوں کے دلوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ جب وہ دوہڑے کا الاپ شروع کرتا ہے تو راہگیروں کے قدم خود رک جاتے ہیں۔ عطاء اللہ خان نے یوں تو میرے لکھے ہوئے کئی گیتوں کو گا کر امر کر دیا ہے لیکن حال ہی میں تحریک انصاف کے لئے لکھے گئے میرے ترانے

جب آئے گا عمران
وہ سب کی جان
بڑھے گی اس ملک کی شان
بنے گا نیا پاکستان

کو گا کر سیاسی جماعتوں کی تاریخ میں مقبولیت کے اعتبار سے ایک نئی تاریخ رقم کر دی ہے۔

سیاست کی ''بھیرویں''

انوار الحق حقی

پروفیسر منور علی ملک میرے میرے انگریزی کے استاد اور عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کے دوست ہیں۔ اپنی کتاب ''درد کا سفیر'' میں لکھتے ہیں اونچے سروں کی شاخوں میں الجھ کر جب یہ آواز کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتی ہے تو روح کا شجر جڑوں تک لرز اٹھتا ہے اور پھر جب اس بلندی سے کسی زخمی پرندے ہی کی طرح یہ آواز ایک ہچکی کے ساتھ نیچے کو آتی ہے تو ہارمونیم پر عطاء کی انگلیوں کی لرزش رقص بسمل کا منظر بن جاتی ہے۔ پروفیسر صاحب اسی پر اکتفا نہیں کرتے وہ مزید لکھتے ہیں کہ یہ آواز وہ آواز ہے جو حلق کی کمان سے تیر کی طرح سُنا کر نکلتی ہے اور تیر ہی کی طرح دل میں پیوست ہو جاتی ہے بشرطیکہ دل کسی انسان کا ہو۔ اس آواز کوئی نام دینا چاہیں تو موسیقی کی لغت کی تنگی داماں کا بھرم کھلتا ہے کہ اتنی موثر اور مقبول آواز کے لئے کوئی لفظ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ شاید اسی لیے کہ انہیں۔ کوئی کہ ایسی کونسی آواز پہلے موجود ہی نہ تھی۔ یوں لگتا ہے کہ اس آواز کو تخلیق کر کے قدرت نے سات سروں کی کائنات میں ایک آٹھویں سر کا

اضافہ کیا ہے اور اس طرح یہ ثابت کر دیا ہے کہ سروں کا خالق بھی انسان نہیں بلکہ وہ خالق عالم خود ہے۔ باکمالوں کی دھرتی میانوالی کے اکثر بیٹوں کو حاصل ہونے والا کمال جغرافیائی سرحدوں سے ماورا نظر آتا ہے۔ عیسیٰ خیل پنجاب اور خیبر پختونخواہ کے سنگم پر آباد ایک ایسا علاقہ ہے جس کے اکثر علاقوں پر ابھی تک اٹھارویں صدی کا گمان ہوتا ہے لیکن اس دور آباد علاقے نے ادب اور موسیقی میں بے پناہ شہرت حاصل کی ہے۔ یہ علاقہ اب پاکستان تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان کے آبائی حلقہ انتخاب این اے ۷۱ کا حصہ ہے۔ اس سے پہلے مولانا عبدالستار خان نیازی اس حلقہ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوا کرتے تھے۔ مولانا عبدالستار خان نیازی بھی اسی علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ نامور شاعر تلوک چند محروم اور ان کے فرزند ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد عیسیٰ خیل کے نواحی قصبہ ''کلور شریف'' سے تعلق رکھتے تھے قیام پاکستان کے بعد وہ انڈیا چلے گئے تھے۔ انڈیا میں اقبالیات کے حوالے سے ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کی شناخت سے دُنیا واقف ہے ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو جس وقت قیام پاکستان کا اعلان ہوا تو ریڈیو پاکستان لاہور سے ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد کا لکھا ہوا قومی ترانہ نشر ہوا۔

ذرّے تیرے ہیں آج ستاروں سے تابناک ۔ اے سر زمین پاک

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی بھی اسی دھرتی کے بیٹے ہیں۔ عیسیٰ خیل جیسے پسماندہ علاقوں سے نکل کر ان کی آواز نے عالمگیر شہرت حاصل کی اور اپنے فن کی بدولت لوک گائیکی کی دنیا میں ایک لیجنڈ کی حیثیت سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ عیسیٰ خیل کی مٹی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں سیاسی شعور بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ پسماندگی اور درماندگی کی آندھی کے باوجود اس علاقے میں حریت فکر کا چراغ بھی کبھی گل نہیں ہوا، بے مایہ مولانا نیازی یہاں سے ایم این اے منتخب ہو جایا کرتے تھے، ساٹھ کی دہائی میں یہاں کے لوگوں نے فیلڈ مارشل ایوب خان نواب آف کالا باغ کے مقابلے میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ انتہائی خوش دلی کے ساتھ انہیں خوش آمدید بھی کہا تھا۔ ۱۹۹۶ء میں عمران خان نے سیاست کا آغاز کیا تو اسی علاقے کے بیابانوں اور کہساروں کے لوگ ان کی پشت پناہی کے لئے آگے بڑھے۔ یہ عیسیٰ خیل کی مٹی کی تاثیر ہی ہیب کہ کچھ سال پہلے شہنشائے لوک موسیقی عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی نے سیاست میں عملی طور پر دوبارہ حصہ لینا شروع کر دیا۔ سرائیکی کو دنیا بھر میں متعارف کروانے والا یہ عظیم فنکار اس سے پہلے بھی عملی سیات میں سرگرم رہا تھا اپنی گلوکاری کے آغاز کے دنوں میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کا حصہ اور اپنی تحصیل کے صدر تھے۔ بعد میں انہوں نے سیاست سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی پوری توجہ موسیقی پر مرکوز رکھی۔ ۲۰۱۳ء کے عام انتخابات سے پہلے انہوں نے پاکستان تحریک انصاف کے لئے ایک گیت گایا۔ انتخابی مہم میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی پُرسوز آواز نے ایک رنگ بھر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ عملی سیاست میں واپس لوٹ آئے۔ ''ان کا کہنا ہے کہ میں نے ذوالفقار علی بھٹو کی وجہ سے سیاست چھوڑ دی تھی اب عمران خان کی وجہ سے سیاست میں واپس آ گیا ہوں۔'' انہوں نے اپنے علاقے میانوالی کو وقت دینا شروع کر دیا کہتے ہیں کہ جب میں یہ گیت گاتا ہوں کہ ''تینوں لے کے جانا ہے میانوالی'' تو ایسا لگتا ہے کہ میں کسی دوشیزہ سے مخاطب ہوں۔ لیکن اپنے شعور میں دنیا کی ہر خوبصورتی میانوالی لانا چاہتا ہوں۔ میانوالی کی پسماندگی مجھے رُلاتی ہے۔ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی جیسا حساس فنکار جب عملی سیاست میں دوبارہ سرگرم ہونے جا رہا تھا تو

اس کے چاہنے والوں کا سینہ دھک دھک کر رہا تھا، سیاست کی بے رحمی اُن کے سامنے تھی اور لالہ عطاء ہی کی گائی ہوئی غزل کا یہ شعر بار بار یاد آتا تھا کہ

وہ پرندے جو آنکھ رکھتے ہیں
سب سے پہلے اسیر ہوتے ہیں

لوک گلوکاری کی بلندیوں کو تسخیر کرنے والے عطاء سیاست کے میدان میں مشکلات کا شکار ہو گئے۔ نرم خو، حلیم طبع، دوسروں کا درد محسوس کرنے والا اور اپنے علاقے کی پسماندگی کا رونا رونے والا یہ لیجنڈ گزشتہ پانچ ماہ سے سیاست کی تلخیوں کا شکار ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ منظّم مخالفت سرگرم ہونے لگی ہے۔ ایک ہفتہ قبل سوشل میڈیا پر ان خبروں کی گردش میں اضافہ ہو گیا کہ عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کی راہیں عمران خان سے جدا ہونے والی ہیں۔ وہ ان دنوں ملک سے باہر ہیں اس لیے ان کی جانب سے وضاحت آنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ اب ان کا یہ بیان سامنے آیا ہے کہ ''وہ کسی عہدے یا منصب کے لالچ سے بے نیاز ہو کر عمران خان کے مشن کے ساتھی ہیں وہ پاکستان تحریک انصاف کا حصہ ہیں اور رہیں گے۔'' یہ بیان ان کی سیاست کی سیاسی پختگی کا مظہر ہے۔ انہوں نے موسیقی کے سروں کو قدرت کی عطا کردہ آواز سے مسحور کیا لیکن بھیرویں پر آ کر اٹک گئے۔ یہاں مجھے ریڈیو پاکستان کے ممتاز سارنگی نواز محمد حسین کی یہ بات یاد آتی ہے کہ ''سارنگی کا سب سے اہم تانت چمڑے کا تانت ہوتا ہے مگر عطاء کی آواز میں نہ جانے کیا بات ہے کہ چمڑے کا تانت ان کی آواز کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ایک آدھ مرتبہ ان کے ساتھ سنگت کا اتفاق ہوا تو پتہ چلا کہ چمڑے کے تانت سے وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ لہٰذا ان کے ساتھ سنگت کے لئے سٹیل کا تار استعمال کرتا ہوں اور سٹیل کے تار سے انگلیوں کے زخمی ہونے سے بچنے کے لئے ان پر پلاسٹر ٹیپ لپیٹ لیتا ہوں۔

ہمارے ہاں کی سیاست حرص و ہوس کی وادی ہے، کلاسیکل لوگوں کے لئے اس میدان میں بہت مشکلات ہیں۔ لالہ عطاء کی سیاست میں سرگرمی پر ان کے کپتانی عمران خان کا کہنا تھا کہ اس میدان میں لوگ کپڑے بھی اتار لیتے ہیں.... عطاء اللہ خان احتیاط کریں۔ عیسیٰ خیلوی کو چاہئے کہ سارنگی نواز محمد حسین کی طرح سیاسی میدان میں لوہے یا سٹیل کا تانت انگلیوں کو زخمی ہونے سے بچانے کے لیے پلاسٹر ٹیپ لپیٹے رہیں کیونکہ ہماری سیاست میں ''یار'' اور ''اغیار'' بدلتے رہتے ہیں۔

عطاء اللہ خان خیلوی کے نام کُھلا خط

عصمت گل خٹک

امید ہے بفضل تعالیٰ آپ بخیریت ہوں گے!

''آپ کو یاد ہوگا..... جب NA-71 کے گزشتہ ضمنی الیکشن میں رنگوں اور روشنیوں سے بھرپور اپنی فنی زندگی کو قربان کر دینے

اور PTI کے ٹکٹ پر آپ نے سیاست کے خاردار میدان میں باقاعدہ قدم رکھنے کی پیشکش کی تو جواب میں ٹکٹ دینے کے وقت عمران خان یا کسی اور پارٹی رہنما نے آپ کے ساتھ اس ضمن میں مشاورات تک گوارا نہیں کی.....

آپ کو یاد ہوگا کہ PTI کی ضلعی صدارت کے لئے جب ضلع میانوالی کے طول وعریض میں آپ نے ایک تھرتھلی سی مچائی اور اپنے اخباری بیانات اور جلسے جلوسوں میں اس نعرے کے ساتھ میدانِ عمل میں اترے کہ آپ کے قائد عمران خان نے آپ کو میانوالی میں سیاسی گند کو صاف کرنے کا مشن سونپا ہے.....مگر جب نامزدگی کا مرحلہ آیا تو آپ ہی کے بقول عمران خان کے'' سخت ناپسندیدہ'' امجد علی خان کو یہ اعزاز بخشا گیا.....آپ جس شاہانہ اور بے نیازانہ مزاج کے مالک ہیں.....ہمارا خیال تھا کہ اس کے بعد سیاست کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیں گے.....مگر آج سچی بات ہے کہ ہمیں اپنے اس خیال پر شرمندگی محسوس ہو رہی ہے اور سیاست میں جس ''مستقل مزاجی'' کا مظاہرہ آپ کر رہے ہیں.....امید واثق ہے کہ مستقبل قریب میں ضلع میانوالی کے سیاسی اُفق پر ایک نیا چمکتا دمکتا ستارہ طلوع ہونے والا ہے.....شوبز اور پھر سیاست میں آمد کے بعد آپ یقیناً'' پبلک پراپرٹی'' اور اس قوم کا قیمتی اثاثہ ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اس مردہ پرست معاشرے میں ایک جیتا جاگتا ہمارا اسٹار کچھ حاسدوں .....خوشامدیوں اور چاپلوسوں کے ہاتھ اس طرح ضائع ہو جائے کہ اس کو خود بھی خبر نہ ہو.....سو، نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ سوالات اور مشورے ''پبلکی'' پیش خدمت ہیں.....امید ہے کسی ڈھلتی رات کی تنہائی میں ان پر غور وفکر کرتے ہوئے نئے سرے سے لائحہ عمل ترتیب دیں گے اور اپنی ماں دھرتی کا قرض اتارنے کی پوری کوشش کریں گے.....

پہلے دو سوال اور آخر میں دو مشورے پیش خدمت ہیں۔

سوال نمبر ۱: ضلعی صدارت کی دوڑ میں آپ اس نعرے کے ساتھ سیاسی میدان میں اترے کہ عمران خان نے آپ کو میانوالی میں سیاسی گند کو صاف کرنے کی ڈیوٹی سونپی ہے مگر آپ نے کبھی اور کہیں بھی یہ وضاحت نہیں کی کہ یہ گند کس کو قرار دے رہے ہیں؟ یا عمران خان کس کو گند کہتے ہیں؟ مثال کے طور پر عمران خان نے میانوالی کی عمومی سیاست میں گند کو ختم کرنے کا کہا تھا؟

اگر آپ کی بات کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں تو پھر آپ کا ٹارگٹ، شادی خیل، روگھڑی اور نوابزدگان کا لاباغ ہونے چاہئیں تھے اور عوامی سطح پر آپ ان کے احتساب پر زور دیتے.....میانوالی کے عوام کے ساتھ ان کی زیادتیوں کو آپ منظر عام پر لاتے مگر آپ نے ایسا کچھ نہیں کہا.....!

سوال نمبر ۲: اگر آپ کے قائد نے PTI میں سے گند صاف کریں تو پھر میانوالی کی پوری قیادت تو آپ کے اردگرد تھی اور آپ کو لالہ جی کے منصب پر بھی بٹھایا ہوا تھا.....اس کے باوجود آپ نے صدارت کے لئے میانوالی کا نہ کوئی مزار چھوڑا اور نہ بازار اور نہ کوئی بیمار چھوڑا.....ان لوگوں میں بھی جا کر آپ نے فاتحہ خوانی کی جنہیں فوت ہوئے بھی اتنا طویل عرصہ گزر گیا تھا کہ خود لواحقین کو آپ کے ساتھ دُعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے پریشانی اٹھانا پڑی.....پھر آپ سمجھتے تھے کہ آپ بلا مقابلہ میانوالی کی صدارت کے منصب پر بیٹھ جائیں گے جس کے آثار بھی موجود تھے کیونکہ موجودہ نامزد صدر امجد علی خان بھی نا صرف آپ کو اس منصب پر دیکھنا چاہتے تھے بلکہ

اپنے حلقہ اثر کے لوگوں کو بھی انہوں نے آپ کے حق میں قائل کر لیا تھا مگر آپ نے ایک جلسے میں امجد علی خان کے حوالے سے ایسی عامیانہ گفتگو کی جس سے نہ صرف تحریک انصاف کے کارکنوں میں اشتعال پیدا ہوا بلکہ آپ کے لاکھوں چاہنے والوں کے اندر.....وہ جو عشق محبت کے خمیر میں گوندھا آپ کا ''امیج'' تھا.....چکنا چور ہو گیا.....پھر آپ نے ذات کے حوالے سے جو'' شعلہ افشائی'' فرمائی.....اس کی آخر کیا ضرورت تھی؟ PTI کے فورم پر نجانے آپ کے اندر تقریباً نصف صدی سے سویا ہوا ذوالفقار علی بھٹو اچانک کہاں سے جاگ اٹھا.....شاید آپ بھول گئے کہ وہ بھٹو تھا.....فخر ایشیاء اور قائدِ عوام تھا.....یہ نقالی آپ کو کتنی مہنگی پڑی اب تک آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا!!

ضلعی صدارت کا خواب ٹوٹنے کے بعد آپ کے مخالفین نے الزامات اور افواہوں کا ایک بازار گرم کیا.....جس میں آپ کے بیرون ملک روانگی اور مسلسل خاموشی نے اہم کردار ادا کیا.....ہمیں آپ کے ایک دبنگ قسم کے فین نے SMS کیا'' عمران خان نے عیسیٰ خیلوی کو زندہ دفن کر دیا''.....بظاہر نظر بھی یہی آتا تھا مگر وطن واپسی پر آپ نے بہت دلیرانہ فیصلہ کیا اور کسی عہدے یا منصب کو لات مارتے ہوئے عمران خان کے عشق کا نعرہ مستانہ بلند کیا.....جس سے نا صرف مخالفین کے منہ بند ہو گئے بلکہ آپ کے سیاسی قد کاٹھ میں مزید اضافہ ہو گیا.....ضلع میانوالی میں PTI کے کارکنوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے آپ کو بخوبی اس کا اندازہ ہے.....حلقہ NA- 71 میں ان کا کوئی پرسان حال نہیں.....اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے بہا دولت سے نوازا ہے.....آپ ہی کے بقول دنیا میں کونسا ایسا کاروبار ہے جس میں دو تین گھنٹوں کے عوض دس بارہ لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہو.....یوں بھی آپ ماشاءاللہ ایک ڈیرہ دار شخصیت ہیں.....دس پندرہ مہمان تو ن ہر روز آپ کے لنگر سے نیاز حاصل کرتے ہیں سو، فوری طور پر آپ اپنے عیسیٰ خیل کے فارم ہاؤس میں کارکنوں کے لئے ایک ایسا گوشہ مختص کر دیں.....جہاں ان کی دادرسی کے لئے نا صرف چوبیس گھنٹے مستعد عملہ موجود ہو بلکہ کھانے پینے کا مناسب انتظام بھی ہو.....دوسرا مشورہ یہ ہے کہ اسی طرح جیل روڈ لاہور کا آپ کا وہ دفتر.....جو عرصہ دراز سے بند پڑا ہے اس کو بھی PTI میانوالی کی وہ آواز گونجے.....جس طرح آپ کی آواز پوری دنیا میں گونجتی ہے.....اب تک کے سیاسی سفر سے لگتا یہی ہے کہ آپ نے سوچ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھا ہے.....تو پھر اپنے فارم ہاؤس کے گیٹ کھول دیجئے.....جیل روڈ کے دفتر کا تالہ توڑ دیجئے.....اپنے موبائل فون پر معلوم اور نا معلوم کی پابندی ختم کر دیں اپنے دروازے پر آنے والے ہر شخص کو شرف ملاقات بخشیں.....اور کھل کھلا کر عوامی سیاست کا آغاز کریں اس لئے کہ؟

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل ، طاؤس و رباب آخر

مختصر تاثرات

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ہمارے تمام گلوکاروں سے منفرد گلوکار ہے جو ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ ہواؤں سے رسنے والی یہ آواز ہر دل کے گنبد میں گونج رہی ہے۔ (عطاء الحق قاسمی)

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی جیسے فنکار روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ فن وہی ہوتا ہے جو چند لوگوں تک یا کسی خاص طبقہ تک محدود نہ ہو۔ عطاء اللہ کا گانا ایک مزدور سے لے کر ایک سرمایہ تک سبھی کو یکساں طور پر محفوظ کرتا چلا جاتا ہے۔ (اشفاق احمد)

کچھ لوگ لفظوں، خیالوں اور خوابوں کو جنم دیتین ہیں لیکن آج ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے پاس ایک ایسا فنکار بھی موجود ہے جس کے گلے میں لفظوں کو زندہ کرنے کا ہنر موجود ہے۔ عطاء اللہ کو چاہنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے مثلاً کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک افسانہ لکھا جو ایک گلوکار کے بارے میں تھا۔ حیرت ہے کہ اُس کے تمام واقعات عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی سے ملتے جلتے تھے اس کا انکشاف مجھے ایک لڑکی نے فون پر کیا تھا او راس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ عطاء اللہ کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتی ہیں جبکہ میں عطاء کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتی ہیں جبکہ میں عطاء کے بارے میں اتنا کچھ نہیں جانتی۔ وہ کہانی تو میرے ذہن کی اختراع تھی۔ میں نے اپنے افسانے میں اس گلوکار سے محبت کا ذکر جس لڑکی کے حوالے سے کیا تھا۔ فون کرنے والی نے بتایا کہ اس افسانے کا وہ خود حقیقی کردار ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خواتین وحضرات دونوں میں مقبول ہے۔ (بشریٰ رحمٰن)

اردو زبان کی ترقی میں لتا اور نور جہاں کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ پاکستان کی ایک آواز عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے بھی ہم ممنون ہیں یہ عظیم گلوکار بھارت میں پاکستان سے کم مقبول نہیں۔ سرائیکی، پنجابی کی یہ گائیکی دلوں کو مربوط کرنے کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اس آواز کو دونوں فضاؤں میں دلکشی بکھیرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں بھارت میں خوش ہو کر بتاتا ہوں کہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی میانوالی کا سپوت ہے اور میں بھی ضلع میانوالی میں پیدا ہوا تھا۔ (رام لعل، بھارت)

بھارت میں رہنے والے میانوالی کے تارکین وطن عطاء کے کیسٹ بڑے شوق سے سنتے ہیں اور ان کیسٹوں کے باعث میرے گھر میں ایک میلہ سا لگا رہتا ہے۔ (جگن ناتھ آزاد، بھارت)

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ہمارے ملک کے معروف گلوکار ہیں۔ ان کا تعلق اگرچہ میانوالی کے ایک معزز مذہبی خاندان سے ہے لیکن اُنہوں نے خاندانی روایات کے برعکس فن موسیقی میں اپنے شوق اور ریاضت کے بل پر ایک قابل رشک مقام حاصل کر لیا ہے۔ میں نے ان کو ملتان اور فیصل آباد میں سٹیج پر دیکھا۔ حسن آواز کے ساتھ قدرت نے انہیں شخصیت سے بھی نوازا ہے۔ عطاء اللہ نے اپنے فن کے ذریعے اپنی مادر وطن اور جنم بھوی عیسیٰ خیل کو بھی اطراف عالم میں سرخرو کیا ہے۔ منور علی ملک نے عیسیٰ خیلوی کو ''درد کا سفیر'' قرار دیا ہے جو ایک خوبصورت ادبی استعارہ ہے۔ فنکار اپنے درد کو فن کے ذریعے تقسیم کرتا رہتا ہے۔ درد اس کے ہاں محبت، عرق ریزی جاں اور خلوص وتجربے کا مظہر ہوتا ہے۔ عطاء اللہ کی آواز میں ایک عجیب سا کرب ہے۔ (محمد افسر ساجد)

گلوکاروں کی روزی پر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے لات ماری ہی تھی مگر آج اس کا مضمون سُن کر معلوم ہوتا ہے کہ ہماری بھی خیر

نہیں۔(مندر میں محراب، کی تقریب رونمائی میں تبصرہ) (ڈاکٹر سلیم اختر)

جسے کروڑوں لوگ بڑا بنادیں اُسے خدا کی ذات کے سوا کون چھوٹا کرسکتا ہے.....

(جنگ فورم) (استاد سلامت علی خان)

میں نے پہلے پہل محمد رفیع کو پسند کیا اور اس کے بعد عطاء کی گائیکی دل پر چھا گئی۔ رفیع اور عطاء میں ایک یہ بات بھی مشترک ہے کہ یہ جتنے بڑے گلوکار ہیں۔ اتنے بڑے انسان ہیں۔ عظمت اور عاجزی دونوں برابر اُن کی شخصیت میں بھری ہوئی ہیں۔ دونوں کسی گھرانے سے نہیں۔ عطاء تو عوام کا محبوب ہے۔ انڈیا میں مزدور سے لے کر دلیپ کمار تک اسے پسند کرتے ہیں۔

(انڈین گلوکارہ (ہیم لتا)

مشرقی ثقافت کا یہ امین سلامت تا قیامت رہے۔ اس کی سحر انگیز آواز ہمیشہ دھرتی کی فضاؤں میں محبت کی صدا بن کر گونجتی رہے اور اپنے فن کی بدولت عوام کے دلوں پر راج کرتا رہے۔ (منشی منشور)

اس میں کوئی شک نہیں کہ پروفیسر منور علی ملک کی کاوش ''درد کا سفیر'' قابل تحسین ہے انہوں نے اپنے مخلص اور پسندیدہ گلوکار دوست عطاء کی مختصر جامع اور دلپذیر سوانح عمری لکھ کر اُس کے فن اور شخصیت کو زندہ جاوید بنا دیا تاہم کتاب پڑھنے کے بعد عطاء کی شخصیت اور فن کے بارے میں تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت سے لے کر کالج کی تعلیم تک کا زمانہ سنہری زمانہ کہلاتا ہے۔ مصنف نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ فنِ موسیقی سے عطاء کی دلچسپی اور اس کے ارتقائی مراحل، اساتذہ جن سے انہوں نے اکتساب فن کیا۔ ہمعصر لوک گلوکاروں اور عطاء کے فن کا تقابلی جائزہ ایسے موضوعات کو مصنف نے اس طرح ہضم کیا ہے جیسے اشتہاروں میں'' قائد آباد کی حیدری پھکی، لکڑی اور پتھر کو ہضم کرتی ہے۔ اسی طرح عطاء کی شادیوں اور دیگر معاشقوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے اتنی دیر لگائی ہے۔ جتنی دیر کوئی موٹر سائیکل سوار چار گیئر بدلنے میں لگاتا ہے۔ (پروفیسر عبدالکریم قاسم)

عطاء نے جس خاص لب ولہجہ کے ساتھ گانا شروع کیا۔ وہ مخصوص لہجہ آج اُس کی پہچان اور شہرت کی وجہ بن گیا ہے۔

(شوکت علی (گلوکار)

اس عہد درد میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز بے شمار دلوں کی ہمراز بن گئی ہے۔ اُس نے اپنی صدا کے سوز سے یہ ریاستیں فتح کر لی ہیں وہ میانوالی کا شناختی کارڈ ہیں یوں تو میانوالی کے بہت سے حوالے ہیں لیکن عطاء اللہ کا نام ایک ایسا چیک ہے جو ہر جگہ کیش ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ عطاء کا فن ہماری تہذیب کا سفیر ہے اُس کی آواز ہماری دوستیوں کی طرح ٹھوس اور کھری ہے۔

(پروفیسر محمد فیروز شاہ)

یہ عطائی فنکار ہے جس نے موسیقی کق وراثت میں نہ پاتے ہوئے بھی اس میں اپنا مقام پیدا کیا ہے اور عطائی ہوتے ہوئے بھی اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔ ہم نے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کے روپ میں صِرف ایک گلوکار کو ہی نہیں بلکہ ایک شاعر کو بھی دیکھا ہے۔ البتہ گلوکاری کے میدان میں افواہ کی طرح پھیل گیا اور یہی اس کی مقبولیت کا راز ہے۔ (دلدار پرویز بھٹی)

میرے لیے یہ اَمر باعثِ مسّرت ہے کہ میرے علاقہ کے ایک معروف فنکار نے اپنی گائیکی کے لئے میری اِس نظم کا انتخاب کیا ہے۔

خدا کرے مِری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گُل جِسے اندیشہ زوال نہ ہو

(احمد ندیم قاسمی)

مجھے اپنا تمام شعری سرمایہ گیتوں اور دوہڑوں کے روپ میں اپنے دوست عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کے لئے وقف کرنے پر فخر ہے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری شاعری سے اِس قدر انصاف کوئی اور گلوکار نہیں کرسکتا تھا۔ (ملک سونا خان بے وسؔ)

لالہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے اتنے زیادہ اور ایسے خوبصورت لوک گیت گائے ہیں کہ اتنے اور ایسے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

(صابر عطاء)

گاتا ہے گیت کرب کے

فاروق روکھڑیؔ

لہجہ خلوص پیار محبت اُسی طرح
ہے اپنے دوستوں سے مروت اسی طرح

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ وہ شاد باد ہے
کرتا ہے روز غم کی تلاوت اسی طرح

بچپن کی چوٹ نے اُسے کُندن بنا دیا
مُکھڑے پہ کھیلتی ہے متانت اُسی طرح

گاتا ہے ڈھولے درد کے وہ اب بھی پَو پھٹے
رکھی ہے اپنے فن سے عقیدت اُسی طرح

جو مادری زبان کی بھولے ہیں لوریاں
ڈھاتا رہے گا اُن پہ قیامت اُسی طرح

گاتا ہے گیت کتب کے دریا میں ڈوب کر
فنکار دے رہے ہیں شہادت اُسی طرح

تائید میری بات کی کرتے ہیں اہلِ درد
وہ بانٹتا ہے پیار کی دولت اُسی طرح

کِس نے کہا، دماغ ہے اب آسمان پر
ہر آشنا سے اُس کی ہے اُلفت اُسی طرح

اُلفت نئی خدا کرئے آ جائے اُس کو راس
پہلے جو تھی رہے نہ شکایت اُسی طرح

فاروقؔ ہم بُھلا چکے اچھی روایتیں
وہ تو نبھا رہا ہے روایت اُسی طرح

عطاءاللہ

نسیم لیہ

سُنا ہے عشق کا بیمار ہے عطاء اللہ
ہمارا قافلہ سالار ہے عطاء اللہ

بغیر درد کے یہ چاہتا نہیں کچھ بھی

اس ایک شے کا خریدار ہے عطاء اللہ

چمک رہا ہو تو محسوس ایسے ہوتا ہے
کہ عندلیب کی مہکار ہے عطاء اللہ

سہاگ اُردو غزل کا بھی اس سے قائم ہے
سرائیکی کا بھی شہکار ہے عطاء اللہ

حواس اب بھی معطر ہیں جسکی خوشبو سے
اُسی گلاب کی مہکار ہے عطاء اللہ

عجیب رنگ کے سُرتال اُس نے چھیڑے ہیں
عجیب طرز کا فنکار ہے عطاء اللہ

وہ بازغہ ہے تو یہ نابغہ زمانے کا
وہ اک کلی ہے تو تلوار ہے عطاء اللہ

جہانِ نو کے تقاضوں پہ ہے نظر اس کی
کہ نسلِ نو کا گلوکار ہے عطاء اللہ

یہ سنگت اُس کی ہے سانولی، سلونی بھی
سلونا سانولا دلدار ہے، عطاء اللہ

کون ایسا ہے

منصور ملتانی

سُر کی دنیا میں کون ایسا ہے؟

جس نے زنجیر ہر روایت کی
اپنے سچے سروں سے پگھلائی
جس کو لائی ہے فن کی بستی میں
لذت درد سے شناسائی
ساز خود کرتے ہیں پذیرائی
سُر کی دنیا میں کون ایسا ہے؟
لوک گیتوں کا وہ شہزادہ
درد کا سفیر کہلائے
ہو کوئی گیت یا غزل کوئی
اسکی سانسوں سے نغمگی پائے
اس پہ جچتی ہے بزم آرائی
سب پہ چھا جائے جس جگہ جائے
سُر کی دنیا میں کون ایسا ہے؟
''مہندی بَنوں کی ہو یا نکیِ گل''
یار بھی اس سے رُس نہیں پایا
ذکر ''چولے'' کا اُس کے گیتوں میں
جس طرح دھوپ کا گھنا سایہ
رات کالی ہو تو ''دھمی ویلے''
پوچھتا ہے کہاں گذار آیا
سُر کی دنیا میں کون ایسا ہے؟
ہر گلی کوچے ہر دریچے میں
اُسکی آواز گونجتی پائی
ہر طرف سُر کے رنگ بکھرے ہیں
چاہے آنگن ہو چاہے انگنائی
کیا کہوں اب تجھے عطاء اللہ

ایک دنیا تری شیدائی
سُر کی دنیا میں تُو ہی ایسا ہے
جس کا گیتوں سے پیار سچا ہے

عیسیٰ خیلوی کیلئے ایک نظم

محمد محمود احمدؔ

رات گے تک جاگنے والے شاعر اور ادیب
ماتھے پر محراب سجائے درگاہوں کے پیر
اپنی اپنی آگ میں جلتی مائیں اور بیوائیں
بس اسٹینڈ پہ شور مچاتے ہاکر اور کلرک
ٹھنڈے فرش پہ سونے والے زندانوں کے قیدی
برف رُتوں میں لکڑیاں کاٹنے والے لکڑہارے
گولیاں ٹافیاں بیچنے والے چھوٹے چھوٹے بچے
سپنے بُنتی دوشیزائیں، ہجر گزیدہ گھبرو
چاند رتوں میں ملنے والے عاشق اور معشوق
میلے مٹی کپڑوں والے مِلوں کے مزدور
فاقے اوڑھ کے سونے والے دھرتی کے مقروض
گھر کا زیور بیچ کے پڑھنے والے طالب علم
بہنوں کے چِنتے میں ڈوبے غیرت مند انسان
سرحدوں پر پہرہ دیتے سارے ڈھول سپاہی
عید کے دن بھی روٹی کپڑے سے محروم بِھکاری
تیرے گیت سے چُن لیتے ہیں اپنی سِسکی

انجانے دُکھوں کا مغنی

منصور آفاق

سردیوں کی ایک شب تھی
اور آتشدان تھا
ہلکی نیلی روشنی میں منجمند تھی خواب گاہ
وقت رقصاں تھا کسی کی دُکھ بھری آواز پر
کوئی افسردہ سا کیسٹ بج رہا تھا ٹیپ پر
کانچ کی کھڑکی پہ تھیں مرکوز نظریں دیر سے
چودھویں کی چاندنی اتری ہوئی تھی فرش پر
چُپ صنوبر کا شجر تھا برف بستہ لان میں
اور اپنے گھونسلے میں کوئی اُجڑی فاختہ
سوچتی تھی کرب میں ڈوبی ہوئی ہر تان پر
میرے زخموں کی خبر کیسے مغنی کو ہوئی

اُداس راتوں کا ساتھی

تنویر شاہد محمد زئی

جب کبھی رات کے سینے سے دھواں اٹھتا ہے
زندگی درد کی آغوش میں سو جاتی ہے
خواہشیں روح کے زنداں میں لہو چاٹتی ہیں
کرب ایسا ہو کہ آنکھوں میں دُھواں بھر جائے
موت بھی سانس کی ہر چاپ سے جب ڈر جائے
میری محروم محبت کے جنازے نکلیں
چاند ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح آوارہ
میرے احساس کے سوکھے ہوئے دریا میں اتر جاتا ہے

کرب ایسا کہ رگیں ٹوٹتی ہیں
شہر مقتل کی طرح لگتا ہے
ایسے عالم میں فقط تیری صدا
جس میں اک کرب ہے، اک سوز تنہائی کا
جس میں ہر شخص کی یادوں کی چتا جلتی ہے
ایسے لگتا ہے کہ سینے میں اتر جاتی ہے
تیری آواز کو سُن کر اکثر
سوچتا ہوں کہ مرے ساتھ کوئی اور بھی ہے
میں کہ اُجڑی ہوئی اس شب میں اکیلا تو نہیں
میرا غم خوار--- میرا یارا--- میرا چارہ گر
میرے سائے کی طرح ساتھ میرے ہوتا ہے
ایسے عالم میں ایک جب سارا جہاں سوتا ہے

وے بول سانول

پروفیسر محمد سلیم احسن

پَھٹ سینے دے کتنے میڈے پھول گیا
وچھڑی کونج دے وانگوں کیڑھا بول گیا

کس ڈُکھ دی آواز دی گنڈھڑی کھولی ہے
کیڑھیا وچ درداں دے دلڑی رول گیا

ویہڑے ویہڑے بَل پئے ڈیوے یاداں دے
کیڑھا رات ہجر دی کالی رول گیا

میں لُکیا ہَم ذات دے اُجڑے کھوہ اندر

میڈیاں مشکاں چار چُدھاروں کھول گیا

کس چا مُل بنڑایا کردے نیراں دا
کیڑھا ہاواں بھاء سونے دے تول گیا

پتھر اکھیاں کِن مِن کِن مِن وسیاں ہن
جذباں اندر ساون کیڑھا گھول گیا

کسی کیتی لجپالی میڈی بولی دی
گھنڈ کیڑھا لفظاں دا میڈا کھول گیا

ایہ احسان عطاء دے کیڈے بھارے ہن
میں کیا احسؔن، مانؔ کریندے سارے ہن

پیارے لالا

منشی منظور حسین

چاہت کے انمول خزانے، تیرے نام
اُلفت کے رنگین زمانے، تیرے نام

تیرے نام سے ہیں منسوب وفا کے گیت
پیار وفا کے سب افسانے تیرے نام

میری سوچوں کا ہے محور تیری ذات
سندر سپنے، خواب سہانے تیرے نام

تیرے نام ہیں میری خوشیوں کے سب گیت

میرے سب جذبے انجانے تیرے نام

تُو ہے اس دھرتی پہ پیار کا شہزادہ
دیتے ہیں آواز دیوانے، تیرے نام

لیلیٰ، سسی، ہیر کے پیار کے گُذرے وقت
پیار کے سارے وقت پرانے، تیرے نام

تو ہے میری پریم کہانی کا عنوان
میں نے لکھے پیار ترانے، تیرے نام

تجھ پہ قربان عیش و سُرور کے سب لمحات
یہ مئے جام اور سب میخانے تیرے نام

تیرے نام ہے میری ہر سچائی بھی
میرے سارے جھوٹ بہانے، تیرے نام

پیارے لالہ! میری نظمیں میرے گیت
دوہڑے، ماہیے، غزلیں، گانے، تیرے نام

تیرا دیوانہ ہے منشی منظورؔ
اس کے پیار کے سب نذرانے تیرے نام

اِک عطاء اِک دُعا

خاموش موسیٰ خیلوی

رات کی کوکھ سے نکلی ہوئی صبح کی کسک
برف کی سِل کا جگر چیرتا ہوا ننھا سا شرر
وقت کی سانس میں اٹکی ہوئی حالات کی چیخ
درد کی ریت میں دھنسی ہوئی پازیب کی لَے
رانجھے کی بانسری کے چھید سے بہتا ہوا کرب
راگ کی نبض سے رِستے ہوئے غم کا قطرہ
کبھی ملہار کی شوخی کبھی کلیان کا سحر
کبھی آسا کی جوانی کبھی دربار کا زہر
ایک زہر اب کے تلخاب میں قند کا ٹکڑا
گوش صحرا میں مہکتے ہوئے پھولوں کی صدا
وقت کی ''سرمد و لاریب'' عطاء

دھرتی ماں

امتیاز حسین امتیاز

پنجے پانی--- تیرے ہانی
تیرے گیت سلکھنے سُن کے
اَج سسی نہیں نیندر مانی
درداں والے دوہڑے سُن کے
اج تڑپھی او ہیر نمانی
توں سسی دا سانول وی ایں
ہیر سوہنی دا چاک
تیئں سدھراں دے کھول ڈتے ہن
بھیڑے ہوئے طاق

توں چرکھے دی گھو کر ونڈیں
توں وجھلی دی تان
توں پنجاب دا پُتر سوہنا
توں دھرتی دا مان

سُر کو زندہ کرنے والے، زندہ رہنا

گفتار خیالی

سُر سُر گم سنگیت کی محفل میں
جب تان تمھاری اُبھری ہے
اُن سچے سچے راگوں میں
جو دیپک بن کے
آگ لگا دیتے ہیں
ایسے لمحوں میں ہر سننے والا
اپنا وصل اور اپنا ہجر
تم پر لاکھوں بار
نچھاور کر دیتا ہے
سُر سنگت کی محفل میں
تشنہ آوازوں کی لَے سے
سب کی پیاس بجھانے والے
تیرے نغموں کے جادو سے
بیتی صدیاں جاگ پڑیں
سب نے امرت پایا تیرے جذبوں سے
تیرا فن جیون بوٹی ہے
سُر کو زندہ کرنے والے
زندہ رہنا----!

ایک دُعا

عمران چوہدری

اِس سے پہلے بھی کئی بار یہ سوچا میں نے
تجھ پہ اک نظم لکھوں
نظم ایسی ہو کہ جیسا تو ہے
تیری آواز--- تراحسن --- تری رعنائی
تیرے لہجے میں سلگتی ہوئی شاموں کا دھواں حرف بنے
اور صندل کے درختوں کی مہک شامل ہو
لفظ اشکوں سے ادا کرتا رہوں
اور ٹھنڈک ہو تو شبنم جیسی
رنگ پھولوں سے چُرا کر لاؤں
اور تتلی کے پروں پر میں لکھوں نظم تری
اب کسی شام کا دکھ، اور کسی شب کا دھواں
تیری تقدیر کی دہلیز تلک نہ آئے
اور ایسی ہی ہزاروں خوشیاں
تیرے آنگن میں ستارے بانٹیں
گر کوئی دُکھ ہے ترے حصے کا
کوئی فریاد، کوئی چیخ اگر باقی ہے
تو میری ذات ہی اس کے لئے کافی ہے
اس سے پہلے بھی کئی بار سوچا میں نے

تیرا درد سفیر

حنیف سیماب

سات سُروں کی محفل میں ہے اونچا تیرا نام نیازی
راگ لاپے دھمیں ویلا، اگنی تیری شام نیازی

دشت دل میں درد بڑا تھا آیا تیرے کام نیازی
جس کی لَے پر قریہ قریہ تڑپیں خاص و عام نیازی

تو نے صد ہا بار کہا ہے سانول تیرا من مندر ہے
سانول تیرے دل کی مستی، سانول تیرا جام نیازی

شہر ہنر میں تو نے آ کر وحشت کو تقسیم کیا
تیرا درد سفیر بنا ہے، تو ہی تشنہ کام نیازی

اب تو تجھے سیماب کو لے کر پیار کے رستے پر چلنا ہے
دیکھ کے چل راہیں مشکل ہیں، قدم قدم ہیں دام نیازی